عشق پُل صراط جیسا

نازیہ رزاق

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نازیہ رزاق

عشق صراط جیسا

"ہم حویلی کب تک پہنچ جائیں گے کبیر چاچا۔" ٹیب پہ اپنی پسندیدہ مووی دیکھتے دیکھتے یکدم اُکتا کر عیان نے کہا۔

"بس بی بی۔ سمجھیں اپنا علاقہ شروع ہوا ہی چاہتا ہے" کبیر چاچا نے مؤدب انداز میں جواب دیا اور گاڑی کی سپیڈ بڑھادی۔

"اچھا!" عیان نے کھڑکی سے باہر بے دلی سے نگاہ ڈالی پھر نگاہ واپس پلٹنا بھول گئی۔ عیان حسن شاہ نے آج سے پہلے کبھی اتنا حسین منظر نہیں دیکھا تھا یا پھر پہلے کبھی محسوس ہی نہ کیا تھا۔ دراصل دیکھنے اور محسوس کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پورے علاقے میں اس وقت سرمئی شام پھیل چکی تھی سڑک کے دونوں اطراف دیو قامت درخت کھڑے تھے جبکہ سڑک کے بائیں جانب نہر تھی۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ نہر سڑک کے ساتھ چل رہی ہے یا سڑک نہر کے۔ بہر حال دونوں ساتھ ساتھ تھیں۔ گندم کی فصل جو پک کے تیار ہو چکی تھی۔ شام کے دھندلکے میں ایسے چمک رہی تھی جیسے پیتل کے برتن۔ عیان حسن شاہ بہت سالوں بعد اپنے آبائی گاؤں "سیداں والی" میں قدم رکھ رہی تھی۔ آج سے بہت سالوں پہلے وہ اپنی

مکمل ناول

منجھلی پھوپھو کی شادی پر گاؤں آئی تھی مگر یہ بہت سالوں پہلے کی بات ہے۔ عیان کو اب اتنا یاد بھی نہیں تھا۔ ابھی بھی اسے گاؤں آنے کی اجازت کبھی نہ ملتی اگر اس کے بابا جان کی طبیعت اتنی بگڑ نہ گئی ہوتی۔ وہ اب پہلے سے بہتر تھے مگر سفر نہیں کر سکتے تھے اس لیے عیان نے بڑی مشکلوں سے گاؤں آنے کی اجازت لی تھی۔ عیان اپنی سوچوں میں مستغرق تھی جب گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔

"کیا ہوا کبیر چاچا؟" اس نے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے ذرا نخوت سے پوچھا لیکن پھر جواب سننے کی مہلت ہی نہ ملی اور عقب سے شدید فائرنگ کی آواز گونجی۔ اس شور میں اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسے بازو سے کھینچ کے باہر نکالا۔ عیان پوری قوت کے بل چیخ رہی تھی اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے مدد کے لیے کبیر چاچا کو پکارا مگر وہ خون میں لت پت زمین پر گرے ہوئے تھے۔ خوف نے اس کے اعصاب کو مفلوج کر دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے ایک تیز رفتار چیز گرم سریے کی طرح اس کے دائیں بازو کو چیرتے ہوئے گزری تھی۔ عیان زمین پر گری اور اس کے بعد اس کے ذہن پہ اندھیرا چھا گیا۔

☆ ☆ ☆

پیر قدرت اللہ شاہ کے آستانے پر اس وقت ہجوم تھا کیونکہ آج جمعرات تھی اس لیے پیر قدرت اللہ شاہ خود مریدگان کے درمیان آستانے پر موجود تھے۔

کشادہ صحن میں صرف پیر قدرت اللہ شاہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ گدی نشین تھے۔ اردگرد لوگوں کا ہجوم تھا جب ایک دیو قامت شخص بڑی تیزی سے دربار میں داخل ہوا اور پیر قدرت اللہ کے کان میں بڑے مؤدب انداز میں کچھ کہا۔ پیر قدرت اللہ شاہ غیض و غضب کے مارے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے سے تفکر و پریشانی ہویدا تھی۔

"اکرم! ڈرائیور کو کہو گاڑی نکالے میں ابھی نکلوں گا اور ہاں جلال شاہ کو بتایا" پیر قدرت اللہ شاہ نے اکرم نامی شخص سے بیک وقت پوچھا اور بتایا تھا۔

"جی شاہ جی! چھوٹے شاہ جی تو پہنچ بھی گئے ہوں گے" اکرم، پیر قدرت اللہ شاہ کو مطلع کرتا ہوا عجلت میں پلٹ گیا اور کچھ دیر بعد پیر قدرت اللہ شاہ کی گاڑی دھول اڑاتی شہر جانے والی سڑک پر رواں دواں تھی۔

☆ ☆ ☆

"شاہ صاحب! اب ان کی طبیعت ٹھیک ہے۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ آپ تھوڑی دیر بعد ان سے مل سکتے ہیں" بڑے جان لیوا انتظار کے بعد ڈاکٹر نے یہ خبر سنا کر گویا تمام گھر والوں کو نئی زندگی بخش دی تھی۔ پیر قدرت اللہ شاہ تشکر بھری سانس لے کر ویٹنگ روم کے صوفے پہ ڈھے سے گئے۔ کوریڈور میں مسلسل چکر کاٹنے کی وجہ سے اعصاب جیسے شل ہو گئے تھے۔ پیر قدرت اللہ شاہ نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

"اگر درّیہ کو کچھ ہو جاتا تو؟" اس سوالیہ نشان سے آگے ان سے کچھ سوچا ہی نہیں گیا۔

پیر قدرت اللہ شاہ اپنے علاقے کی سب سے بڑی سیاسی سماجی اور روحانی شخصیت تھے۔ شہرت، عزت، حکومت صحیح معنوں میں ان کے گھر کی باندی تھی۔ پیر قدرت اللہ شاہ اپنے والد محمد حسین شاہ کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کی شادی پھوپھی زاد جنت بی بی سے ہوئی جو کہ نہایت نیک و صالح اور شاہ صاحب کی دل پسند بیوی تھیں۔ اللہ نے انہیں اوپر تلے تین "رحمتوں" سے نوازا پھر منتوں اور دعاؤں کے بعد "نعمت" سے بھی نوازدیا۔ تینوں بیٹیوں بالترتیب شاہینہ، زرمینہ اور بختاور کی جان ان کے اکلوتے بھائی سید حسن شاہ میں تھی۔ پیر قدرت اللہ شاہ کو اپنی تینوں بیٹیوں سے بہت محبت تھی مگر چھوٹی بیٹی بختاور میں تو ان کی جان اٹکی رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ بختاور کو اپنے لیے "بخت آور"

سمجھتے اور کہتے۔

"میری یہ بیٹی میرے لیے بڑی ہی بخت آور ہے اس کی پیدائش والے دن میں نے ملکوں کے خلاف اپنی سینکڑوں ایکڑ اراضی کا مقدمہ جیتا تھا۔" ملک خاندان سے دشمنی سیدوں کے خاندان میں پیدا ہونے والے ہر بچے کو وراثت میں ملتی اور گھٹی میں تحفے کے طور پر دی جاتی تھی۔

وقت کا خمیر کسی مسلسل حرکت کرنے والے مادے سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ کبھی بھی کسی کے لیے بھی نہیں رکتا۔ لوگ سالوں کسی حسب خواہش لمحے کا انتظار کرتے ہیں مگر وقت ظالم عقاب کی طرح وہ لمحات چڑیا کے بچے کی طرح چھین کر لے جاتا ہے۔ صرف یاد کی کسک لیے دھندلا سا عکس ذہن و دل پر رہ جاتا ہے پھر وہ کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔

اسی چلتے ہوئے وقت کے پہیے نے پیر قدرت اللہ شاہ کے مزاج کو ایک ٹھہراؤ دیا تو دوسری طرف ان کی اولاد کو جوانی کی دہلیز پہ لا کھڑا کیا تھا۔ شاہینہ اور زرمینہ معمولی تعلیم حاصل کر کے گھر بیٹھ گئیں۔ حسن شاہ کو پیر قدرت اللہ شاہ نے پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا۔ بختاور نے بھی تعلیم جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی جسے تھوڑی پس و پیش کے بعد مان لیا گیا۔ وقت کچھ اور آگے کو سرکا۔ شاہینہ کی شادی سید وقار شاہ جو کہ پیر قدرت اللہ شاہ کے رشتہ دار تھے، سے کر دی گئی جبکہ زرمینہ کا رشتہ شاہ صاحب کے چچا زاد بھائی کے بیٹے سے طے تھا۔ جو ابھی صرف ایک سال کا تھا۔ حویلی پہ قیامت تو اس وقت ٹوٹی جب پیر قدرت اللہ شاہ نے بختاور کی منگنی کسی جگہ طے کی مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ یہ سن کر سب انگشت بدنداں رہ گئے کیونکہ حویلی میں اس طرح کی جرأت پہلے کسی نے نہ کی تھی۔ حویلی کے ماحول میں عجیب تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہر کوئی دوسرے سے آنکھ چرائے پھرتا۔ نہ شاہ صاحب اپنی بات سے پیچھے ہٹ رہے تھے اور نہ بختاور کوئی لچک دکھانے کو تیار تھی۔ جنت بی بی کی طبیعت روز بروز بگڑتی چلی گئی ایک دن وہ شاہ صاحب کے قدموں میں اپنا دوپٹہ ڈال کر نڈھال سی فرش پر گر گئیں اور اپنی لاڈلی بیٹی کی خوشیاں مانگ لیں۔

پیر قدرت اللہ شاہ کو چپ لگ گئی تھی۔ زندگی کے کسی محاذ پر انہیں اتنی بری طرح سے شکست نہیں ہوئی تھی مگر انہوں نے اپنی زندگی کا کٹھن ترین فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ جس نے بھی سنا وہ دنگ رہ گیا۔ قدرت اللہ شاہ نے حسن شاہ کو حکم دیا تھا کہ وہ بختاور کو شہر لے جا کر ان کی شادی اسی لڑکے سے کروا دیں جس سے کہ وہ چاہتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی پورے خاندان سمیت ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ بختاور روتی رہیں، تڑپتی رہیں مگر انہیں صفائی کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ قدرت اللہ شاہ نے اپنا دل جیسے پتھر کر لیا تھا۔ بختاور کی شادی کے بعد ان کا نام بھی حویلی میں لینا ممنوع تھا۔

قدرت اللہ شاہ نے انہیں اپنی زندگی سے ایسے نکال دیا تھا جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔

حسن شاہ اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ قدرت اللہ شاہ نے اپنی کسی جاننے والی کی بیٹی سے ان کا رشتہ طے کر دیا۔ شادی کے بعد حسن شاہ، روحیلہ جیسی خوب صورت اور پڑھی لکھی بیوی پا کر مسرور و مطمئن تھے۔ ابھی شادی کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ جنت بی بی چل بسیں۔ قدرت اللہ شاہ بہت مغموم ہوئے۔ حسن شاہ کو اللہ نے ایک بیٹے جلال اور بیٹی عیان سے نوازا تھا۔

حسن شاہ جو کہ اپنے حلقہ سے ایم این اے منتخب ہو چکے تھے بذریعہ کار لاہور سے اسلام آباد جاتے ہوئے شدید قسم کے حادثے کا شکار ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے، اس وقت جلال شاہ نو برس جبکہ عیان صرف پانچ برس کی تھی۔ قدرت اللہ شاہ کے لیے یہ بہت بڑا جھٹکا تھا۔ اکلوتے بیٹے کا بھری جوانی میں ساتھ چھوڑ جانا انہیں بالکل ہی توڑ گیا تھا۔ روحیلہ بچوں کی تعلیم کی وجہ سے شہر میں ہی رہائش پذیر تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ حسن شاہ کو پوری منصوبہ بندی سے قتل کیا گیا تھا اس لیے قدرت اللہ شاہ بچوں کو گاؤں اور دشمنوں سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

قدرت اللہ شاہ نے اپنے داماد وقار شاہ کو ایم این اے کی سیٹ دلا دی جبکہ خود وہ صوبائی وزیر ثقافت تھے۔ قدرت اللہ شاہ اپنے پوتے اور پوتی دونوں سے بڑی محبت رکھتے تھے مگر عیان سے محبت کا اور ہی عالم تھا۔ وہ لاشعوری طور پر عیان میں بختاور کا عکس ڈھونڈتے تھے۔ عیان کے پاس ہر چیز کی فراوانی تھی چاہے وہ حسن ہو، دولت ہو یا سب کی محبت۔

وقت کی مٹھی سے سال ریت کی طرح پھسلے تھے۔

عیان تیرہ سال کی ہوئی تو روحیلہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ عیان ابھی اتنی چھوٹی تھی کہ دکھوں کا اظہار کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ جلال جو کہ اس سے کچھ سال بڑے تھے، اپنی بہن کے لیے جذباتی اور اخلاقی سہارا ثابت ہوئے۔ قدرت اللہ شاہ کی توجہ بچوں پر کچھ اور بڑھ گئی۔ جلال شاہ نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی کلاس فیلو سارہ سے دادا جان کی رضامندی کے ساتھ شادی کی جو کہ ایک بریگیڈیر کی بیٹی تھی۔ قدرت اللہ شاہ کو جلال شاہ کے باپ بننے کا شدت سے انتظار تھا کیونکہ حویلی کی روایت کے مطابق جلال شاہ بیٹے کی پیدائش کے بعد ہی گدی نشیں ہو سکتے تھے ورنہ نہیں۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شادی کے چار سال بعد بھی جلال شاہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ سارہ کے تمام ٹیسٹ کلیئر تھے مگر جلال شاہ کی رپورٹس کے مطابق وہ باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھے، یہ خبر خاندان بھر کے لیے قیامت صغریٰ سے کم نہ تھی، قدرت اللہ شاہ تو جہاں کے تہاں رہ گئے۔ تقدیر نے کیسا بے بس کیا تھا۔ اگر سارہ میں کوئی نقص ہوتا تو وہ اپنے پوتے کے لیے بیویوں کی لائن لگا دیتے مگر بات ان کے پوتے پہ آ گئی تھی۔ ان دنوں عیان کالج جانے لگی تھی۔ وہ اپنے دادا کا حد سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ سب ہی جانتے تھے کہ جلال شاہ حویلی کے اکلوتے وارث ہیں اور خاندان کا نام و نشان ان کے دم سے ہی چلنا تھا۔ مگر قدرت اللہ شاہ مجبور تھے۔ انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد اور اپنی بیٹی شاہینہ کے ایما پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ عیان کی شادی اپنے نواسے تبریز شاہ سے کر دیں اس طرح عیان کا بیٹا ہی حویلی کا اگلا گدی نشیں ہو گا۔ اس طرح خاندان بھر کی امیدوں کا مرکز عیان کی ذات تھی جو ان تمام فیصلوں سے بے خبر لمز یونیورسٹی سے آئی آر میں ماسٹرز کر رہی تھی مگر اس واقعے نے سب کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے اگر عیان کو کچھ ہو جاتا تو۔۔۔؟

”داجان“ جلال شاہ نے نرمی سے پیر قدرت اللہ شاہ کا کندھا ہلایا تو وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئے تھے۔

”ہوں“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے جلال شاہ کی طرف دیکھا۔

”داجان وہ میں کہہ رہا تھا کہ آپ حویلی چلے جائیں میں اور سارہ ہیں یہاں پر۔۔۔۔۔ کل آپ کی بہت ضروری میٹنگ ہے جبکہ ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ عیان کو شاک لگا ہے ورنہ تو گولی کندھے کو چھو کر گزری

ہے۔" وہ کچھ دیر کو رکے تھے۔ "ویسے بھی کل تک اسے ڈسچارج کر دیا جائے گا تو ہم اسے لے کر سیدھے حویلی جائیں گے۔ اب اس کا اکیلا شہر میں رہنا ٹھیک نہیں۔" جلال شاہ نے انہیں حویلی جانے کے لیے تیار کرنا چاہا، وہ کسی بھی طرح قدرت اللہ شاہ کو حویلی بھیجنا چاہتے تھے۔ قدرت اللہ شاہ بھی الوداعی کلمات کہہ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

پیر قدرت اللہ شاہ اس وقت شدید اضطراب کے عالم میں مسلسل یہاں سے وہاں ٹہل رہے تھے۔

"جب ہم نے کسی بتایا ہی نہیں تھا کہ عیان آرہی ہے تو دشمنوں کو کیسے خبر ہو گئی؟" قدرت اللہ شاہ اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے تھے اور اضطراب و پریشانی سے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے انہوں حویلی کے سب سے پرانے اور قابل اعتماد بزرگ ملازم دینو چاچا سے کہا۔

"شاہ صاحب تھالی کا چھید تا رہا ہے کہ یہ کسی اپنے خاص بندے کا کام ہے۔" دینو چاچا نے اپنے مخصوص انداز میں غداری کا سراغ لگانا چاہا تھا۔

"بہرحال، یہ کام جس نے بھی کیا ہے سیدھا سیدھا ہماری پگڑی پہ ہاتھ ڈالا ہے۔ اب نتیجہ تو اسے بھگتنا ہی پڑے گا مگر پہلے تو ملکوں سے نمٹنا ہے جنہوں نے حملہ کروا کے اپنی تباہی پر مہر لگا دی ہے۔" قدرت اللہ شاہ نے اپنے ازلی رعب دار لہجے میں کہا۔

"دین محمد، تم ملک کو بلاوا بھیجو اور اسے کہو کہ جلد حاضری دے۔" شاہ صاحب نے حکم دیا۔

"اور ہاں کسی کو خبر نہ ہو ملک کے آنے کی ورنہ دشمن چوکنا ہو جائے گا۔" شاہ صاحب نے مزید کہا۔

"جی شاہ صاحب۔" یہ کہتے ہی دین محمد باہر نکل گئے جبکہ شاہ صاحب کچھ پرسکون ہو گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب ملک سب سنبھال لے گا۔

پیر قدرت اللہ شاہ کی داؤد ملک سے ملاقات پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ داؤد ملک، دین محمد کی بیوی بختاں کی بھانجی کا بیٹا تھا۔ ماں باپ کی وفات کے بعد مستقل طور پر دین محمد اور بختاں کے پاس قیام کے لیے آ گیا تھا۔

دین محمد اپنے بیٹے بخش محمد اور داؤد ملک کو شاہ صاحب کے پاس نوکری چاکری کی غرض سے لایا تھا۔ بخش محمد دس جماعتیں پاس تھا اس لیے شاہ صاحب نے اسے حساب کتاب پہ لگا دیا۔ جبکہ داؤد ملک کے مضبوط قد کاٹھ اور تنومند وجود کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ سیکیورٹی کے لیے رکھ لیا۔ بعد میں قدرت اللہ شاہ کو اس بات کا صحیح معنوں میں ادراک ہوا کہ ان کا فیصلہ کس قدر درست تھا۔ شاہ صاحب کو وہ شروع دن سے ہی غیر معمولی طاقت ور محسوس ہوا تھا اس لیے انہوں نے اپنے ایک گارڈ کو جو کہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھا' داؤد ملک کی ٹریننگ کی خاص ہدایت کی اور کچھ عرصے کی ٹریننگ نے اسے ناقابل تسخیر بنا دیا۔ قدرت اللہ شاہ نے داؤد ملک کے متعلق مکمل چھان بین کروائی کہ وہ کہیں ان کے دشمنوں کا بھیجا ہوا تو نہیں مگر وہ واقعی بختاں کی بھانجی کا بیٹا تھا جو کراچی کے کسی کوٹھ کی رہنے والی تھی اور پنجاب کے کسی علاقے سے بیاہ کر گوٹھ گئی تھی۔ اب وہ شاہ صاحب کے بہت ہی خاص بندوں میں سے تھا۔ وہ پورے علاقے کے لیے دہشت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ شاہ صاحب کا دشمن خاندان "ملک خاندان" بھی داؤد ملک کا کچھ نہیں بگاڑ سکا کیونکہ ارد گرد کے گاؤں میں جتنے بھی بدقماش اور بدمعاش لوگ بستے تھے وہ سب داؤد ملک کے زیردست اور دوست تھے اور کہیں اور سے "بندے" منگوا کر داؤد ملک پر حملہ کروانے کا مطلب سارے علاقے کے "آسیبوں" سے دشمنی مول لینا تھا' اس لیے اب قدرت اللہ شاہ کو خطرہ نہ تھا اور نہ ہی ان کی سلطنت کو۔ مگر اس واقعے نے انہیں صحیح معنوں میں مضطرب کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ملک، دشمن کو ایسا زخم لگانا ہے جو ساری عمر نہ بھر پائے" قدرت اللہ شاہ نے اپنے مخصوص رعب دار انداز میں داؤد ملک کو حکم دیا تھا جو کچھ ہی دیر پہلے بڑی

حویلی پہنچا تھا۔

"جو حکم سائیں۔" جواباً داؤد ملک نے بھی اپنے ازلی مؤدب لہجے میں نظروں کو جھکائے ہوئے کہا۔

"میری پوتی آج شام حویلی آرہی ہے اس کے آنے سے پہلے دشمن کا حساب بے باق کردو۔" شاہ صاحب نے مزید کہا۔

"جو حکم سائیں۔" داؤد ملک نے کہا اور سلام کرتا باہر نکل گیا۔ اب قدرت اللہ شاہ کو شام کا بے تابی سے انتظار تھا کیونکہ ان کو دو خوشیاں ملنے والی تھیں۔ ایک عیان کے گھر آنے کی۔ دوسری دشمن کے تلملانے کی۔

"احتیاط سے بیٹا۔ زیادہ بازو نہیں ہلانا۔" شاہینہ پھوپھو نے بے جا لاڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ عیان حویلی آ گئی تھی اور اس وقت سے ڈرائنگ روم مچھلی بازار بنا ہوا تھا۔ شاہ صاحب جلال شاہ کے علاوہ گھر کی خواتین اور نوکروں میں عجیب افراتفری پھیلی تھی، وقار شاہ بھی پہنچ چکے تھے۔ کچھ ملازمین بھاگم بھاگ رات کے کھانے کی تیاری کررہے تھے تو کچھ قدرت اللہ شاہ کی اکلوتی پوتی کو دیکھنے کے اشتیاق میں بلاوجہ ڈرائنگ روم کے چکر کاٹ رہے تھے۔ باہر تاریکی زمین پر اپنے قدم جمانے کے لیے ہلکان ہورہی تھی۔

"زیادہ درد تو نہیں ہو رہا دادا کی جان کو؟" قدرت اللہ شاہ نے عیان کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔

"نو، اٹس آل رائٹ۔" عیان نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس حادثے کے بعد وہ تھوڑا سہم گئی تھی۔

شاہینہ پھوپھو کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی سیماب تھیں جو کہ نکاح شدہ تھیں جبکہ رخصتی ابھی ہونا تھی۔ اس سے چھوٹا تبریز شاہ جو کہ ان دنوں شکار پر گیا ہوا تھا۔ جبکہ سب سے چھوٹا سالار شاہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا اور تعلیم کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم تھا۔ زرمینہ پھوپھو کی دو جڑواں بیٹیاں تھیں۔ ازلہ اور انشراح جو کہ اولیول میں تھیں۔

"کھانا لگ گیا ہے شاہ صاحب۔" ملازم نے کہا تو قدرت اللہ شاہ سے تھا مگر دیکھا بغور عیان کو تھا۔

"چلو عیان، پہلے ڈنر باقی باتیں بعد میں۔" قدرت اللہ شاہ کے کہنے پہ سب ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئے جبکہ شاہ صاحب اپنے فون کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ جس پہ کال آرہی تھی۔

ڈائننگ روم میں سب اپنی اپنی کرسیاں سنبھال چکے تھے اور قدرت اللہ شاہ کا انتظار کررہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل انواع واقسام کی ڈشز سے بھرا پڑا تھا۔ قدرت اللہ شاہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو ان کے چہرے پہ فتح کی سرشاری تھی۔

"سنا ہے ملکوں کے اکلوتے داماد کا قتل ہوگیا ہے۔" ٹیبل پر اپنی مخصوص کرسی سنبھالتے ہوئے انہوں نے وقار شاہ اور جلال شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا جو کہ قدرت اللہ شاہ کے لہجے میں دبا دبا جوش دیکھ کر حیران رہ گئے تھے جبکہ خواتین بالکل چپ تھیں۔

"میں نے ملک کو کہا ہے۔ وہ کل آئے گا۔ اسے راضی کردینا۔" شاہ صاحب نے جلال شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔" جلال شاہ سمجھ گئے کہ یہ کارنامہ بھی داؤد ملک کے ہاتھوں ہی انجام پایا۔

"داجان آپ نے بلایا تھا۔" جلال شاہ نے قدرت اللہ شاہ کے مقابل کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت پیر قدرت اللہ شاہ کے اسٹڈی روم میں موجود تھے۔

"میں نے عیان کی یونیورسٹی کے متعلق کچھ فیصلہ کیا ہے، سوچا تم سے ڈسکس کرلوں۔" قدرت اللہ شاہ نے اپنا چشمہ اتار کر رائٹنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ضرور، پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے۔" جلال شاہ آگے کو جھکتے ہوئے بولے۔

"جلال! میں نے سوچا ہے کہ ملک کو عیان کے ساتھ حفاظت کے لیے رکھوں۔ فارم ہاؤس کا کیا ہے وہ تو کوئی بھی دیکھ لے گا۔ عیان کی زندگی سب سے اہم

ہے۔" وہ سانس لینے کو رک کے پھر بولے۔
"صرف آٹھ دس مہینوں کی ہی تو بات ہے۔ اس کا تھرڈ سمسٹر چل رہا ہے۔ فروری تک وہ فارغ ہو جائے گی پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، تم کیا کہتے ہو؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے جلال شاہ کی طرف دیکھا جو گلا کھنکار کے گویا ہوئے۔
"مجھے کیا کہنا ہے داجان! آپ نے یقیناً" بہتر ہی سوچا ہو گا مگر داور ملک؟" وہ ذرا ہچکچائے۔
"ہی از ڈوئنگ۔" وہ رک کے پھر بولے۔
"یقیناً" ملک سے زیادہ عیان کسی کے ساتھ محفوظ نہیں لیکن پھر بھی..." وہ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ فیصلہ یقیناً" بہت دشوار تھا" اگر آپ کہیں تو ہم گارڈز کی ایک گاڑی ساتھ بھیج سکتے ہیں۔" یعنی جلال شاہ کی طرف سے انکار تھا۔ شاہ صاحب پیشانی مسلتے ہوئے بولے۔
"تمہارے خدشات بجا ہیں کہ وہ ستائیس، اٹھائیس سالہ نوجوان ہے۔ وہ بھی ایک نہایت خوبرو نوجوان" وہ ہلکا سا مسکرائے۔
"لیکن میں اپنی پوتی کو جانتا ہوں۔ وہ اپنے معیار سے نیچے کبھی نہیں اترے گی۔" قدرت اللہ شاہ نے جلال شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے کہا۔ جلال شاہ نے بے ساختہ نظریں چراتے ہوئے کہا۔
"میں نے ایسا تو نہیں کہا کہ عیان....!" پیر قدرت اللہ شاہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اگر گاڑی بھر کر گارڈز ساتھ بھیج بھی دوں تو میری تسلی نہیں ہو گی بلکہ اس طرح وہ خوف کا شکار ہو جائے گی کہ یقیناً" اس کی جان کو زیادہ خطرہ ہے... اور بیٹا موت کا خوف موت سے بھی زیادہ جان لیوا ہوتا ہے۔ میں عیان کو کسی خوف کے حوالے نہیں کر سکتا۔" انہوں نے قطعی انداز میں کہا۔ گویا وہ فیصلہ کر چکے تھے۔
"جی بہتر، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" جلال شاہ جانتے تھے کہ وہ عیان کے بارے میں کبھی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔ اس لیے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یسی کو بھجوا دو۔ کچھ بات کرنی ہے۔" قدرت اللہ شاہ نے رائٹنگ ٹیبل پہ پڑا ہوا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پہ لگاتے ہوئے کہا۔
"جی اچھا... شب بخیر۔" جلال شاہ واپس مڑ گئے۔

☼ ☼ ☼

"پلیز داجان آئی ایم گیٹنگ لیٹ" عیان نے ملتجی انداز میں قدرت اللہ شاہ کی جانب دیکھا جو اسے بھرپور ناشتہ کروانے پر تلے ہوئے تھے۔
"اونہوں! پہلے جوس ختم کرو۔" شاہ صاحب نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے حکم جاری کیا تو اس کا روکھا انداز دیکھ کر سبھی مسکرا اٹھے سوائے شاہینہ پھوپھو کے جو شاہ صاحب کی وجہ سے عیان کو الوداع کہنے کے لیے اٹھ تو گئی تھیں مگر نیند سے بوجھل آنکھیں لیے ابھی تک "صم" "بکم" کی عملی تفسیر بنی بیٹھی تھیں۔
"لیں ہو گیا ختم!" عیان نے ایک ہی سانس میں جوس اندر انڈیلا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ قدرت اللہ شاہ ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھے اور عیان کے کندھوں پر بازو پھیلا کر اسے لیے باہر کو چل دیے۔
"میں نے یسی کو کہا تھا تمہیں سب کچھ بریف کر دے۔ آئی ہوپ تم معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرو گی۔" قدرت اللہ شاہ نے بات کے آغاز کے لیے تمہید باندھی تھی۔
"اوہ ہاں، رات کو یسی آپی نے بہت لمبا اور بورنگ لیکچر دیا تو تھا" عیان نے شرارت ولاپروائی سے جواب دیا اور تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔
"مائے گاڈ! آپ سب لوگ مجھے ایسے سی آف کرنے جا رہے ہیں جیسے میں کسی مونٹیسوری اسکول جا رہی ہوں وہ بھی پہلے دن، اینڈ پلیز مجھے ان تکلفات کی عادت نہیں ہے۔" عیان کے کہنے پر شاہ صاحب نے سب کو جانے کا اشارہ کیا اور عیان کو لے کر آگے بڑھے وہ مین ڈور پار کر کے کار پورچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شاہ صاحب نے ابھی بھی عیان کو کندھوں سے

تھام رکھا تھا۔

"عیان تم جانتی ہو ناں کہ تم ہمارے لیے کتنی امپورٹنٹ ہو۔" انہوں نے ہمارے پر زور دے کر کہا تھا۔ "تمہارے بغیر سب ادھورا ہے... نامکمل۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کوئی لاپروائی نہیں بیٹا۔ ملک کو بالکل بھی نہیں ستانا۔ اسے چکمہ دے کر غائب ہونے کی عقل مندی کبھی مت کرنا ورنہ تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔" قدرت اللہ شاہ کی آواز لرزی تھی۔ انہوں نے عیان کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا تھا۔ وہ ایک دم بولی۔

"کیا ہے دادا ڈارلنگ! آپ تو بالکل ٹین ایجرز والے ڈائیلاگ بول رہے ہیں۔ آپ رہنے ہی دیں۔ میں ویسے ہی "اس کی" ہر بات مان لوں گی۔" کتنی ہی دیر سے وہ گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر عہد و پیمان کر رہے تھے۔ عیان نے گاڑی دیکھی تو جوش سے تالی بجا کر بولی۔

"یا ہو... cadillac escalade آئی لائک اٹ' بلٹ پروف ہے ناں۔ اب مجھے بلٹ سے بہت ڈر لگتا ہے۔" عیان نے گاڑی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی پسند کا اظہار کیا تھا اور ڈر کا بھی۔ پھر شاہ صاحب کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"نو' مجھے لینڈ کروزر نہیں چاہیے۔ یونیورسٹی میں ہر تیسرے اسٹوڈنٹ کے پاس ہوتی ہے۔" عیان نے منہ بسور کر کہا۔ کچھ فاصلے پہ کھڑی ٹیوٹا لینڈ کروزر کے پاس کھڑے وجود نے بے حد ناگواری سے عیان حسن شاہ کی بات کو سنا تھا۔

"اوکے' یہ تمہاری ہوئی۔ ملک ادھر آجاؤ۔ عیان کو اس گاڑی میں جانا ہے۔" شاہ صاحب نے بڑے لاڈ کے ساتھ عیان کو ماتھے پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا جبکہ عیان تو سامنے سے آتے... وجود کو دیکھ کر حیران و مبہوت رہ گئی۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں اتنا شاندار مرد نہیں دیکھا تھا۔

"رفیق جاؤ اس گاڑی کی چابی لے کر آؤ۔" قدرت اللہ شاہ نے ملازم آواز دے کر کہا اور داؤد کو کچھ ہدایات دینے لگے۔ عیان نے ذرا فرصت سے اس کا جائزہ لیا۔ کیمل کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس وہ نوجوان چھ فٹ سے اوپر کا ہی ہوگا۔ وہ مسلز مین تھا' اس بات کا اندازہ اسے دیکھتے ہی ہو جاتا تھا۔ بال بہت سیاہ تھے' ماتھے پہ گرے ہوئے۔ بے حد شفاف رنگ۔ چہرے پہ ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو تھی۔ عیان نے اسے دس میں سے دس نمبر دے دیے۔ اسی لمحے داؤد نے نظریں اٹھا کر قدرت اللہ شاہ کو اپنی فرمانبرداری دکھاتے ہوئے "جو حکم سائیں" کہا تھا۔ عیان کا حیرت کے مارے منہ کھل گیا۔ اس کی آنکھیں بالکل عیان جیسی تھیں' ہیزل براؤن۔

"اوکے بیٹا۔ گڈ بائے۔ رات کو ملاقات ہوتی ہے پھر۔" قدرت اللہ شاہ کی بات پر وہ ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"اوکے دا جان' گڈ بائے" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے مڑی تو حیران رہ گئی کہ داؤد ملک اس سے پہلے گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ عیان نے بے ساختہ مڑ کے شاہ صاحب کو دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے اور اس کے کان میں بولے۔

"یہ تمہارا شوفر نہیں ہے۔" اس بات پر عیان نے پہلے حیرت پھر غصے سے شاہ صاحب کو دیکھا اور پاؤں پٹخ کے گاڑی میں جا بیٹھی۔ پیر قدرت اللہ شاہ کی مسکراہٹ کچھ مزید گہری اور ذو معنی ہو گئی جبکہ عیان حسین شاہ کے لیے یہ دن "سرپرائز ڈے" ثابت ہوا تھا۔

صبح سے مسلسل پیریڈ اٹینڈ کر کر کے عیان کوفت میں مبتلا ہو گئی تھی اور اب فری کلاس میں وہ چاروں دوست کیفے ٹیریا میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھیں' برگر انجوائے کر رہی تھیں جبکہ عیان ہمیشہ کی طرح "سوں سوں" کرتی ناک کے ساتھ چوتھے سموسے کے لیے ہاتھ بڑھا چکی تھی۔ داؤد ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں داخلی دروازے پر جمی ہوئی تھیں جبکہ باقی سب کی اس پر۔ عیان صبح سے اس کا تعارف کرواتے کرواتے تھک گئی تھی حالانکہ جس طرح وہ

اس کے ساتھ ساتھ تھا کوئی بھی ذی ہوش سمجھ سکتا تھا کہ وہ عیان کو گارڈ کر رہا ہے لیکن اس کے باوجود لڑکیاں تو لڑکیاں، لڑکے تک عیان سے اس کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ اس کے تحمل سے بتانے پر وہ داؤد کو ایسی نظروں سے دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں "لگتا تو نہیں!"

"عیان یار! اس کی آنکھیں بالکل تمہارے جیسی ہیں۔ آفت" شہرین نے اپنے ہی انداز میں تعریف کی تھی۔ عیان نے چونک کر داؤد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ ویسا ہی سکوت تھا اور آنکھیں سرد مہری۔ جانے کیوں عیان کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نظر آئی تھی۔ عیان کے بھیجے سموسے اور کوک اس کے سامنے ویسی کی ویسی ہی پڑی تھی۔

"ویسے تیرے دادا نے کیا سوچ کر اس سپر ہینڈسم بندے کو تیرے ساتھ باندھ دیا ہے وہ بھی آٹھ نو ماہ کے لیے۔ ابھی تو مئی چل رہا ہے۔ فروری تک تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" زویا جیسے سب ٹام بوائے کہتے تھے اس نے اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

"کیا مطلب 'کیا ہو سکتا ہے' ہاں؟" عیان نے اپنی پلیٹ پرے کھسکاتے ہوئے زویا کو گھور کر کہا۔ اسی لمحے عفیرہ نے اس کی کہنی زور سے ہلائی تو اس نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت اور نازو ادا والی لڑکی عشناء یوسف ان لوگوں کی طرف آ رہی تھی۔

"ہیلو! عیان ڈیئر کیسی ہو؟ تمہارے ایکسیڈنٹ کا سن کر بہت افسوس ہوا" عشنا چھا جانے والی شخصیت رکھتی تھی۔ ابھی بھی وہ نشست سنبھالتے اتنے سوالات بھی کر گئی تھی جبکہ وہ سب تو اسی شاک میں تھیں کہ عشناء نے ان کو ملاقات کا شرف بخشا۔ عشناء سکاٹ لینڈ میں پلی بڑھی تھی اور وہیں کی گریجویٹ تھی۔ لیمن کلر کی بیگی شرٹ، وائٹ ٹائٹس اور سفید ہی پمپس (Pumps) پہنے کمر تک آتے بالوں کے ساتھ جن میں ایک بھی لہر نہ تھی۔

خوب صورت خدوخال کی مالک عیان بھی کسی سے کم نہ تھی مگر عشناء میں ادا بہت تھی۔

"تمہارا کزن تو بہت رُوڈ ہے۔ کس ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن لیا ہے اس نے؟" عشناء نے اپنی دھیمی آواز میں نزاکت کے ساتھ باٹم اور رج بلونڈ بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے عیان سے پوچھا اور ترچھی نظروں سے داؤد کو دیکھا۔

"واٹ! کزن..... تمہیں کس نے کہا کہ یہ میرا کزن ہے۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن وہ میرا پرسنل باڈی گارڈ ہے۔" عیان نے ذرا سخت لہجے میں کہا تھا کیونکہ اسے عشناء کا رویہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیوں پر یقین تھی کہ داؤد عیان کا کزن ہی ہے۔

"باڈی گارڈ! ڈونٹ ٹیل می یار" عشناء نے ستائشی نظروں سے داؤد کو دیکھتے ہوئے بے یقینی سے کہا۔

"مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔" عشناء نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"جب تمہیں یاد آجائے تو مجھے بھی بتا دینا" یہ کہتے ہوئے عیان نے گویا کہا تھا کہ "تم اب جا سکتی ہو۔" عشناء کا بھی جیسے مطلب پورا ہو چکا تھا۔ وہ اٹھی اور داؤد کی ٹیبل کے عین سامنے کھڑی ہو گئی۔ اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی دو انگلیوں کو خاص انداز میں لہرا کر داؤد کو "ہائے" بولا تھا۔ اس نے لاپروائی سے دیکھ کر دوبارہ اپنی نظریں دروازے پہ جما دیں تھیں۔ زویا کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ عشناء برا مانے بغیر مسکراہٹ اچھالتی باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

ٹیلر سوفٹ (Taylor Swift) کا گانا گنگناتے ہوئے وہ اپنی ہی دھن میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب اچانک کسی سے ٹکرائی۔ اس کا تو سر ہی گھوم گیا تھا۔

"دھیان سے عیان حسن شاہ۔" اس سے ایک سیڑھی اوپر کھڑے جوان نے اسے بازو سے تھام رکھا تھا۔ عیان نے الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے تبریز شاہ کہتے ہیں' نام تو سنا ہی ہو گا۔" تبریز نے قہقہہ لگایا تو۔ عیان کو وحشت سی محسوس ہوئی' وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

"او ہیلو! کیسے ہیں تبریز بھائی؟" عیان نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوں بلکہ بہت اچھا ہوں۔" تبریز نے دھیرے سے مسکرا کر ذو معنی لہجے میں کہا۔ جینز کے ساتھ پرپل اینڈ وائٹ ٹی شرٹ پہنے' بڑی بڑی مونچھوں کو بائیں ہاتھ سے بار بار تاؤ دیتا تبریز شاہ' عیان کو کچھ عجیب ہی لگا تھا۔ عیان کو سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر بات کرنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن تبریز اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

"کس کے ساتھ گئی تھیں یونیورسٹی؟" تبریز نے بغور اسے دیکھتے ہوئے عام سے انداز میں سوال کیا۔

"میں.....وہ۔"

"یہ داؤد ملک کے ساتھ گئی تھی۔" یمی آپی نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عیان کی جان چھڑاتے ہوئے خود جواب دیا۔ مگر تبریز کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

"واٹ! داؤد ملک کے ساتھ۔" حیرت کی زیادتی سے اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"اور یہ کس عقل مند کا فیصلہ ہے" تبریز تو پہلے سے ہی اکھڑ چکا تھا۔ اور اب تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ غصے سے کسی کو کال ملا رہا تھا۔ عیان نے اسے ذرا ناگواری سے دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

تبریز شاہ کو عیان کا داؤد کے ساتھ ہونا ہرگز گوارہ نہ تھا لیکن قدرت اللہ شاہ کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ اس لیے وہ تھک کے خود ہی خاموش ہو گیا جلال شاہ ممبر قومی اسمبلی تھے اس لیے ان کا قیام زیادہ تر اسلام آباد میں ہی ہوتا تھا اسی طرح سینیٹر وقار شاہ بھی اسلام آباد میں رہتے تھے۔ عیان کو یونیورسٹی آتے' جاتے دو ماہ گزر گئے۔ اس دوران عیان نے کبھی بھی داؤد کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر اس بات کا اسے یقین سا ہونے لگا تھا کہ داؤد جب بھی اسے دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں ہمیشہ نفرت ہی ہوتی۔ مون سون کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ مون سون کی پہلی بارش' دھیمی دھیمی سی مگر مسلسل۔ عیان جب یونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر نیچے آئی تو لاؤنج میں یوگا کرتی یمی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"عیان آج چھٹی کر لیتیں۔ ویسے بھی باہر بارش ہو رہی ہے۔"

"آج ہی تو یونیورسٹی جانے کا مزا ہے یمی آپی" وہ تیزی سے کہتے ہوئے مین ڈور پار کر گئی تھی جبکہ اپنے کمرے سے نکلتے تبریز نے جلدی سے موبائل پہ کسی کو کال کی تھی۔ "احتیاط علاج سے بہتر ہے۔" تبریز شاہ دل و جان سے۔ اس مقولے کا قائل تھا۔

عیان کے فائنل ایگزامز قریب تھے اس لیے سب ہی اسٹوڈنٹس زور و شور سے پڑھائی میں مشغول تھے۔ عیان نے داؤد کو تنگ کرنے کے لیے خود کو اسٹوڈنٹس کی بھیڑ میں گم کر لیا تھا اور نظر بچا کے لائبریری میں گھس گئی اور لائبریری کی کھڑکی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ متوحش سا ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور عیان کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ ہونٹ کا دایاں کونہ دانتوں تلے دبائے' مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے اپنے سیل فون سے اس کی تصویر بنائی اور اسے اقرار کرنا پڑا کہ وہ بلاشبہ بہت ہینڈسم تھا۔

"کسی کو ستانے کا یہ طریقہ بالکل ٹھیک نہیں ہے عیان۔" وہ تصویر سیو (Save) کر رہی تھی جب اچانک زویا کے کہنے پر فوراً" ڈر کے موبائل اپنے پیچھے چھپایا تھا۔

"میں تو..... صرف" وہ ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہ رہی تھی جب زویا نے کھڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ یہاں کیا کر رہی ہے" عیان نے گردن موڑ کر دیکھا جانے کیوں اسے یہ منظر برا لگا تھا۔ بہت برا وہ باہر کو لپکی "تو جادو چل گیا عشناء کا۔" زویا کی بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ وہ عشناء کے سر پہ پہنچ گئی

جبکہ داؤد دوسری طرف جاچکا تھا۔

"بڑی ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں داؤد سے مجھے بھی تو بتاؤ کونسا عالمی مسئلہ زیر بحث تھا" عیان کے چباچبا کے کہنے سے عشناء حق دق رہ گئی۔

"آئندہ اسے ادائیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے اگر تم نے اس سے دوبارہ بات کرنے کی کوشش کی تو۔۔۔ بہت برا پیش آؤں گی" عیان نے شہادت کی انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو عشناء محظوظ ہونے والے انداز میں ہنس دی۔

"Oops عیان حسن شاہ تم تو بچوں کی طرح لڑنے ہی پہنچ گئیں۔ مانا کہ وہ تمہاری تفریح ہے لیکن کیا ہے ناں کہ میں خوب صورت چیز دیکھ کے رہ ہی نہیں پاتی اس لیے۔۔۔"

"اوجسٹ شٹ اپ "تفریح" کی ضرورت تم جیسیوں کو ہوتی ہے اور صرف اتنا یاد رکھو کہ داؤد پہ ٹرائی نہیں مارنا۔ انڈر سٹینڈ!" جانے کیوں وہ اس قدر مشتعل ہو رہی تھی۔

"او کم آن عیان! اب یہ مت کہنا کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے کیونکہ یہ اسٹوری بہت گھسی پٹی ہے۔ بہت فلمیں اور ڈرامے بن چکے اس ٹاپک پہ تم یہ تاریخ مت دہرانا" عشنا نے خباثت سے مسکرا کر کہا۔ "کیوں تم کوئی نئی تاریخ رقم کرنے والی ہو۔ آئی مین کلاس فیلو کا سپر ہینڈسم باڈی گارڈ۔۔۔" زویا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ عشناء نے تیز نظروں سے زویا کو گھورا جبکہ وہ پھر سے گویا ہوئی۔

"یاد رکھنا مس عشناء یوسف محبت کی کہانی تو روز اول سے وہی ہے۔ بس کردار بدل جاتے ہیں۔"

"پھر بھی میری پیش گوئی کو ایزی مت لینا" زویا کی بات کے جواب میں عشنا نے صرف اتنا کہا اور تیزی سے پلٹ گئی۔ عیان نے گہری سانس بھر کر زویا کو دیکھا جو سامنے سے آتے داؤد کو دیکھ رہی تھی پھر آہستگی سے بڑبڑائی۔

"یہ کم از کم اس زمین کا نہیں ہے" یہ بات تو پکی ہے۔" عیان نے مسکرا کر زویا کو دیکھا اور پھر داؤد کو جو اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا اسی کی طرف آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈپارٹمنٹ میں فیرویل پارٹی تھی۔ عیان خوب صورت ڈیزائنر سوٹ میں ملبوس تھی۔ آٹھ بجے کے قریب ڈنر سرو کر دیا گیا۔ سبھی انجوائے کر رہے تھے۔ عیان کی دوست اس کی تعریفیں کر کر کے ہلکان ہو رہی تھیں اور یہ کوئی غلط بھی نہیں تھا۔ وہ جب سے یونیورسٹی آئی تھی تعریفیں ہی وصول کر رہی تھی۔ ہر طرف لڑکے لڑکیوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ ہر کسی نے اپنے لباس سے اپنی کلاس شو کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب بھی ٹھہرے تھے۔

کچھ اسٹوڈنٹس کو اپنی انگلش مہمان خصوصی کی الوداعی تقریر بہت پسند آئی تھی جس میں انہوں نے اپنے انگریزی لب و لہجے میں اردو کا جملہ بولتے ہوئے کہا۔ "لیز والا ام سالا بہت ٹیلنٹڈ ہے۔" اسٹوڈنٹس نے اس تعریف پہ آسمان سر پہ اٹھا لیا تھا۔ عنیزہ اور شہرین بار بار عیان کو یہی کہہ رہی تھیں کہ ہو نہ ہو اس نے اور داؤد نے ڈیسائیڈ کر کے بلیک اینڈ وائٹ کنٹراسٹ پہنا ہے کیونکہ داؤد اتفاقیہ طور پر بلیک شلوار سوٹ میں تھا۔ صرف عنیزہ اور شہرین ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگوں کو یہی خیال آیا تھا۔ ڈنر کے بعد تمام ٹیچرز اور وی سی، مہمان خصوصی کے ساتھ کولڈ کافی انجوائے کر رہے تھے جبکہ تمام اسٹوڈنٹس علیحدہ ہال میں چلے آئے تھے۔ ڈی، جے کے سونگ پلے کرنے کی دیر تھی، سب نے ادھم مچا دیا تھا۔ جسٹن بیبر کے گانے Boy Friend پر سب ہی پاگل ہو رہے تھے۔ داؤد کو عیان کے ساتھ ساتھ رہنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ عیان نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ذرا چیخ کے داؤد کو مخاطب کیا تھا۔

"تم نے ڈنر کیوں نہیں کیا میں۔۔۔!" وہ ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ داؤد کے عقب سے عشنا نمودار ہوئی۔ ہاتھ میں مشروب تھامے وہ لڑکے لڑکیوں سے

پچتی ہوئی داؤد کے قریب آئی عیان کے اندر کچھ سلگنے لگا تھا۔

"ہیلو مسٹر داؤد' کیسے ہیں آپ' اینڈ یو آر لکنگ ایکسٹریملی سٹننگ۔" عشنا ہمیشہ کی طرح چھا گئی تھی۔ اس نے بلیک جینز پہ بلیک ٹاپ پہن رکھا تھا جو سامنے سے بہت چمکیلا تھا۔ بالوں کا رنگ برگنڈی ہو چکا تھا۔ عیان کو یہ بے تکلفی ذرا نہ بھائی وہ ذرا رخ موڑ کے کھڑی ہو گئی اور اپنے ہاتھ میں موجود مشروب کی سطح پہ تیرتے آئس کیوبز کو بغور دیکھنے لگی جو اس کی طرح پگھل رہے تھے۔ آہستہ آہستہ... مگر مسلسل۔

"ہیلو گارجیئس۔" کسی نے عیان کے قریب سرگوشی کی۔ عیان نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے فائنل ایئر کا سمیر فاضل کھڑا تھا۔

"ہیلو۔" عیان نے بمشکل مسکراتے ہوئے فارمیلٹی نبھائی۔

"مس شاہ آپ تھوڑی دیر کے لیے میری بات سن سکتی ہیں' جسٹ فار فیو منٹس۔" سمیر نے اپنی سرخ آنکھیں عیان پہ گاڑتے ہوئے پوچھا۔ سمیر کو وہ ہائی اسکول کے زمانے سے جانتی تھی۔ سمیر کا جھکاؤ ہمیشہ سے عیان کی جانب تھا۔ عیان کی نظر میں وہ ایک بے ہودہ انسان تھا کیونکہ اس میں اپر کلاس کی تمام برائیاں بدرجہ اتم موجود تھیں لیکن سمیر کے لجاجت بھرے انداز کے پیش نظر عیان نے مسکراتے ہوئے "شیور" کہا تو وہ نہال ہوتا اسے ساتھ لیے باہر نکلنے لگا۔

"کہاں جانا ہے سمیر؟" عیان نے جھنجلا کر پوچھ ہی لیا کیونکہ وہ اسے لیے یونیورسٹی کے قدرے تاریک حصے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ عیان کو اب گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ داؤد کو بتائے بغیر ہی آگئی تھی۔ اردگرد اور بھی کپل موجود تھے اور آپس میں مگن تھے۔ عیان کو خوف سا محسوس ہوا۔

"میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو ایکچوئلی تم ہو ہی گارجیئس۔" سمیر نے اپنے لڑکھڑاتے وجود کو بمشکل سنبھالا ہوا تھا۔

"یہ تو تم مجھے اندر بھی کہہ سکتے تھے؟" عیان نے بغیر لحاظ کیے تنک کر کہا اور مڑ کے دیکھا۔ "نہیں' یہاں تو تمہارے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے لایا تھا۔" سمیر نے خباثت سے کہتے ہوئے عیان کے چہرے پہ جھولتی ہوئی لٹ کو ہٹایا۔

"بی ہیو سمیر۔" عیان نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے سمیر کا ہاتھ جھٹکا۔ جواباً سمیر نے وہی ہاتھ تھام لیا۔

"تم نے میرا ہاتھ کیسے پکڑا؟" عیان کا چہرہ غصے کے مارے سرخ پڑ گیا۔

"ایسے۔" سمیر نے کمینگی سے قہقہہ لگاتے ہوئے دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا۔

"چھوڑو مجھے۔" عیان نے اپنے ہاتھ چھڑانے کے لیے پوری طاقت کا استعمال کیا مگر سمیر صرف اسے تنگ کر رہا تھا اس کا ایسا ویسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ عیان کا فیملی بیک گراؤنڈ اچھی طرح جانتا تھا اور اس کی عزت کرتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا' داؤد کے ایک ہی جھٹکے نے اسے دھول چاٹنے پہ مجبور کر دیا۔ سمیر کی چیخ و پکار کی وجہ سے اور لوگ بھی متوجہ ہو گئے جبکہ داؤد پہ تو گویا کوئی جنون سوار تھا۔ داؤد اسے بے تحاشا پیٹتے ہوئے گالیوں سے بھی نواز رہا تھا۔ اردگرد موجود اسٹوڈنٹس سمیر کی حالت دیکھ کر خوف سے کانپنے اور چیخنے لگے تھے۔ عفیرہ بھاگ کے بت بنی عیان کے پاس آئی۔

"عیان روکو اسے' وہ مار دے گا سمیر کو۔ پلیز روکو اسے۔" عفیرہ چیخ کے بولی تو عیان گویا ہوش میں آئی۔

"داؤد چھوڑو اسے... چھوڑو۔" عیان نے داؤد کو بازو سے تھام کے اسے روکنا چاہا لیکن اس نے ایک بار پھر سمیر کو ہاتھوں میں اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تو سب ہی اسٹوڈنٹس کی چیخیں نکل گئیں۔ عیان کا دوپٹہ نیچے گر گیا۔

"چھوڑو جنگلی... مر جائے گا وہ۔" عیان نے دونوں ہاتھ اس کے سینے پہ رکھ کر پیچھے دھکیلا۔ داؤد رک گیا تھا۔ عیان اب گھٹنوں کے بل سمیر کے قریب بیٹھ کر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اس کے گال تھپتھپا رہی تھی مگر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکا

تھا۔
"بی بی چلیں۔" داؤد کی سرد مہر آواز سنائی دی مگر عیان نے اپنا کام جاری رکھا۔ وہ سمیر کے دوستوں کو آواز دینے لگی جو خوف زدہ سے آگے بڑھ آئے۔
"بی بی چلیں۔" داؤد نے پھر مداخلت کی۔
"میں تمہاری ملازمہ نہیں ہوں جو تمہاری مرضی سے آؤں جاؤں گی۔" عیان نے چیخ کے جواب دیا۔ داؤد نے نیچے پڑا عیان کا دوپٹہ اٹھایا اور عیان کا بازو تھام کر اسے کھڑا کیا۔
"مجھے نہیں جانا۔" عیان نے اپنے بازو سے اس کا ہاتھ ہٹانا چاہا مگر وہ عیان کو کھینچتے ہوئے پارکنگ لاٹ تک لایا، پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھنے لگا جب عیان نے غصے سے اسے پیچھے دھکیلا مگر وہ وہیں جما کھڑا تھا۔
"سمجھتے کیا ہو خود کو، ہاں کیا سمجھتے ہو۔ وہ دوست ہے میرا تم نے مجھ سے پوچھے بنا ہی اس پہ دھاوا بول دیا۔" وہ غصے میں پاگل ہو رہی تھی۔ داؤد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔
"تم مجھے پروٹیکٹ کرنے کے لیے ہو نہ کہ ڈکٹیٹ کرنے کے لیے۔" عیان نے لڑاکا عورتوں کی طرح بایاں بازو کمر پر ٹکا کے دائیں ہاتھ کی انگلی اس کے سینے پہ بجا کے کہا جبکہ داؤد بازو سینے پہ باندھے بایاں ابرو اچکا کے اسے دیکھتا رہا۔ عیان نے بھی اسی طرح ابرو اچکا کے اسے دیکھا۔۔۔ وہی ہمزاد آنکھیں۔ کچھ سے ہوتے ہیں جو باندھ لیتے ہیں۔ یقیناً" یہ وہی لمحہ تھا "بی بی چلیں" داؤد نے ان لمحوں کے فسوں سے دامن چھڑاتے ہوئے کہا۔ عیان کی فطری ہٹ دھرمی عود کر آئی تھی۔
"نہیں جاؤں گی، میں بھی دیکھتی ہوں تم مجھے کیسے لے کے جاتے ہو یہاں سے۔" عیان نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا، داؤد اس کی طرف گھوما، اس نے عیان کو بازوؤں سے تھاما اور کسی کانچ کی گڑیا کی طرح اٹھا کے گاڑی میں ڈال دیا اور گاڑی کا دروازہ زور سے بند کر کے گویا اسے چڑایا تھا۔ عیان پہلے تو حیرانی سے کچھ بول ہی نہ پائی پھر اس نے زور و شور سے رونا شروع کر دیا۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے وہ داؤد پہ چیخ رہی تھی۔
"ہاؤ ڈیر یو۔۔۔ یو سلیو (تمہاری ہمت کیسے ہوئی۔ بدتمیز) عیان نے خونخوار لہجے میں کہا اور اپنے داجان کا نمبر ملانے لگی۔ اس نے روتے ہوئے انہیں ساری بات بتائی۔
"مجھے نہیں چاہیے یہ آئرن مین۔۔۔ اگر اس کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا تو میں یونیورسٹی ہی چھوڑ دوں گی، عیان نے غصے سے فون بند کر دیا۔ داؤد زیر لب مسکرایا۔
"آئی ہیٹ یو مین۔" عیان نے آئی فون ڈیش بورڈ پہ دے مارا۔
ڈیڑھ گھنٹے بعد عیان حویلی میں داخل ہو رہی تھی۔ اب وہ نارمل ہو چکی تھی۔ گاڑی پورچ میں رکی تو پیر قدرت اللہ شاہ کے ساتھ جلال شاہ اور تبریز شاہ بھی باہر نکلے اور پورچ کی طرف آئے۔ عیان کو اب صحیح معنوں میں شرمندگی ہو رہی تھی۔ عیان نے داجان کو سلام کیا تو انہوں نے اسے ساتھ لگا لیا اور پیچھے سے آئے داؤد ملک کو بغور دیکھا جس نے ہاتھ میں عیان کا کلچ اور آئی فون تھام رکھا تھا۔ تبریز شاہ پہلے ہی داؤد کے خلاف بھرا بیٹھا تھا اس نے قدرت اللہ شاہ کے بولنے کا انتظار کیے بغیر ہی داؤد پر چڑھائی کر دی۔
"یہ کیا تماشا کیا ہے تم نے آج۔۔۔ تم، تم عیان کے باپ بننے کی کوشش مت کرو۔ ملازم ہو تو ملازم ہی بن کر رہو۔ ہمارے لیے چار بندوں کو مار دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم ہمارے سر پر چڑھ کے ناچنے لگو۔ تمہاری اوقات ہی کیا ہے کہ تم اس کے دوستوں پہ تشدد کرو اور اس کے ساتھ زبردستی" تبریز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اتنے دقیق الفاظ استعمال کرے کہ پیر قدرت اللہ شاہ داؤد کو اس نوکری سے ہی فارغ کر دیں جبکہ داؤد ہمیشہ کی طرح بے تاثر نظروں سے تبریز کو دیکھ رہا تھا۔ عیان تو تبریز کے الفاظ پہ حق دق رہ گئی۔
"آپ کون ہوتے ہیں داؤد سے اس طرح بات کرنے والے، اس کی انسلٹ کرنے والے، یہ ہمارا

آپس کا معاملہ ہے۔ ہم خود دیکھ لیں گے۔" عیان نے شدید اشتعال کے باعث داجان کی پروا کیے بغیر ہی تبریز کو بے نقط سناڈالیں۔

"یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا عیان... ایکسکیوز کریں تبریز سے فوراً"۔" جلال شاہ نے اپنے نرم لہجے میں عیان کو سختی سے کہا۔ پیر قدرت اللہ شاہ بغور داؤد کو دیکھ رہے تھے جو اپنے جوتے دیکھ رہا تھا۔

"نیور... پہلے یہ داؤد سے ایکسکیوز کریں۔" عیان کے سختی سے کہنے پہ باقی تو باقی خود داؤد بھی حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا جو اس کے لیے ڈٹ گئی تھی۔ تبریز کو داؤد کے سامنے شدید ہتک کا احساس ہوا۔

"عیان کیا ہوا میری جان... ڈونٹ بی چائلڈ۔ تبریز آپ کے لیے پریشان تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ آپ کو اس طرح بی ہیو نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں ملک تم بھی جاؤ اب، کل شام فارم ہاؤس پہ بات ہوتی ہے پھر..." قدرت اللہ شاہ داؤد کو حکم دے کر عیان کو لیے اندر کی جانب بڑھ گئے۔ داؤد بھی عیان کا آئی فون اور کلچ جلال شاہ کو دے کر باہر کو چل دیا جبکہ تبریز وہیں کھڑا رہ گیا۔

قدرت اللہ شاہ نے معاملہ بہت مشکل سے سنبھالا تھا۔ سمیر کے والد ایک بہت بڑے صنعت کار تھے، انہوں نے اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کے خاصا شور مچایا تھا مگر قدرت اللہ شاہ نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے بات دبادی اور داؤد کو بھی تنبیہہ کی۔

✡ ✡ ✡

یونیورسٹی میں کلچرل ڈے منایا جا رہا تھا۔ ہر طرف رنگ و نور کی بہار اتری ہوئی تھی۔ عیان نے بلیک کھلے گھیر والی شلوار، بلیک قمیص جس کے گلے اور دامن پر زرد رنگ کی امبرائیڈری تھی۔ زرد بڑے سے دوپٹے کے ساتھ پہن رکھا تھا۔ داؤد سے اس کی بول چال مکمل طور پر بند تھی۔ وہ اس سے حقیقتاً" ناراض تھی۔ وہ اپنے گروپ کے ساتھ کیفے جا رہی تھی جب ماس کمیونیکیشن ڈپارٹمنٹ کی ونیشا راجپوت نے اسے گھیر لیا اور اپنے اسٹال سے اسے زبردستی مہندی لگانے لگی۔ ونیشا نے بہت خوب صورت مہندی لگائی اور عیان کے دونوں ہاتھ بھر دیئے جبکہ عیان ایک دم پریشان ہو گئی، اب وہ بیگ کیسے اٹھائے گی؟ اس نے مدد طلب نظروں سے ادھر ادھر دیکھا مگر اسے اپنی کوئی دوست کہیں نظر نہ آئی، داؤد آگے بڑھا۔ اس کا شولڈر بیگ اٹھایا اور مؤدب انداز اپنا مخصوص جملہ بولا۔

"بی بی چلیں۔" عیان اپنی مہندی دیکھتی آگے بڑھ گئی۔

عیان کے موبائل کی گھنٹی زور و شور سے بج رہی تھی۔ اس نے ناراض نظروں سے داؤد کو دیکھا پھر اپنی نیم خشک مہندی کو دیکھا اور ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ داؤد کے لبوں پہ مسکراہٹ نے جھلک دکھائی تھی، اس نے کال پک کر کے فون عیان کے کان سے لگا دیا۔ وہ پہلی بار اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فون اس کے کان سے لگائے۔ دوسرے ہاتھ میں اس کا بیگ تھامے۔ دیکھنے والوں نے شاید پہلے اتنا پیارا منظر نہ دیکھا ہو گا۔ دور دور سے انہیں دیکھتی، ان کا پتا پوچھتی محبت ان تک آن پہنچی تھی اور ان کے درمیان کھڑی سانس لینے لگی تھی۔ فون بند ہو جانے کے بعد داؤد نے فون بیگ میں رکھا اور سر اٹھا کے عیان کو دیکھا جو اتنے دنوں بعد مسکرائی تھی۔

"تم... تم عجیب لگ رہے ہو ایسے... لڑکیوں کی طرح بیگ اٹھائے گھومتے ہوئے۔" وہ اپنی ہنسی روکنے کے لیے کتنے جتن کر رہی تھی۔ اس نے اپنا بایاں بازو آگے کیا تو داؤد نے بیگ کندھے پہ ڈال دیا۔ وہ اچانک بولی۔

"سنو، میرے بائیں ہاتھ کی تیسری والی بڑی انگلی ڈھونڈو۔" اس نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو دائیں ہاتھ سے ڈھانپ کر اس کے آگے کیا۔ داؤد مسکراتے ہوئے بے ساختہ آگے بڑھ کے دیکھنے لگا۔ مہندی کی وجہ سے وہ کچھ احتیاط کر رہی تھی، داؤد نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اسی لمحے فضا میں زوردار دھماکا ہوا، ایک لمحے

کے لیے تو کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ داؤد نے تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کے عیان کو اندر کیا۔ اپنی رائفل نکال کے ابھی وہ سیدھا ہی ہوا تھا کہ اسے رک جانا پڑا' اس کے ہاتھ اس کے پہلو میں گر گئے عیان کا قہقہہ اس کے کانوں سے ٹکرایا کیونکہ یہ اسٹوڈنٹس کی سیلیبریشنز تھیں' فضا میں ہر طرف افشاں اڑ رہی تھی۔ غباروں کے جتھے اڑائے جا رہے تھے۔ ڈی جے اور بھی دھماکے دار آوازیں پیدا کر رہا تھا۔ عیان نے داؤد کو دیکھا جو بغور اسے دیکھ رہا تھا مگر یہ کچھ دیر پہلے والا داؤد نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں عیان کو وہی نفرت نظر آئی۔ جو وہ ہمیشہ سے اپنے لیے محسوس کرتی تھی۔ اس بار وہ نفرت اتنی واضح تھی کہ چاہنے کے باوجود عیان کوئی خوش کن خیال نہ سوچ سکی۔

☆ ☆ ☆

ستمبر کا اینڈ چل رہا تھا عیان کے تھرڈ سمسٹر کے پیپرز ہو رہے تھے اور ساتھ ساتھ مون سون کی بارشیں بھی۔ عیان کو داؤد ان دنوں بہت مضطرب دکھائی دے رہا تھا' پہلے سے بھی زیادہ چوکنا۔ جیسے اس کا بس چلتا تو وہ حویلی میں بھی اس کی پہرہ داری کرتا۔ جبکہ عیان کچھ تھکی تھکی سی تھی' اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ یا وہ جو چاہتی ہے وہ ممکن بھی ہے۔۔۔ یا نہیں۔

☆ ☆ ☆

"داؤد۔" عیان کی دل سوز چیخ سے حویلی کے در و دیوار لرز اٹھے تھے۔ اور خود عیان کے گلے میں خراشیں پڑ گئی تھیں جیسے وہ اب کبھی نہ بول سکے گی۔ گھپ اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"داؤد۔" وہ ایک بار پھر چیخی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اسے کچھ یاد نہ رہا' وہ کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے۔ یاد رہا تو صرف ایک منظر۔ وہ جوتا پہنے بغیر باہر کو بھاگی۔ اونچی آواز میں روتے ہوئے بغیر ادھر ادھر دیکھے وہ مین ڈور کی طرف گئی' باہر نکلنے تک وہ ہانپنے لگی۔

"داؤد۔" وہ اسے آواز دے کر ایک بار پھر رونے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کی طرف جاتی' پیچھے سے یمی آپی کی حیران و پریشان آواز سنائی دی۔

"عیان کیا ہوا؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟" یمی آپی کے ساتھ لگانے پہ وہ اور زور و شور سے رونے لگی۔

"داؤد' یمی آپی! اسے کچھ ہوا ہے۔ پلیز مجھے اس کے پاس جانا ہے۔" وہ عجیب بے ربط گفتگو کر رہی تھی۔ یمی آپی اسے لیے ہوئے لاؤنج کی طرف بڑھیں۔ ننگے پیر' بکھرے بال' سوجی آنکھیں۔ اس کی حالت مخدوش ہو رہی تھی۔

"اب بتاؤ کیا ہوا ہے؟" یمی آپی نے اسے کاؤچ پہ بٹھایا اور خود ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"یمی آپی۔۔۔ وہاں بہت اندھیرا تھا۔ داؤد کا خون نکل رہا تھا۔ پلیز یمی آپی میں مر جاؤں گی ایسے۔ داؤد کو بلا دیں اسے کچھ ہوا ہے۔" وہ پھر سے بے ربط باتیں کرنے لگی۔ یمی آپی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ بے یقینی سے عیان کو دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ میں اسے کال کرتی ہوں۔ یا اللہ وہ ٹھیک ہو۔" وہ ہچکیوں کے درمیان بڑبڑاتے ہوئے لینڈ لائن سے داؤد کا نمبر ملانے لگی۔

"تم نے خواب دیکھا ہے۔ صرف "خواب"۔" یمی آپی نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر کریڈل پر رکھ دیا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں یمی آپی' پلیز میرا دل بند ہو رہا ہے۔" وہ ایک بار پھر فون کی طرف ہاتھ بڑھا چکی تھی۔

"تم اس طرح کی حرکتیں کر کے اپنے خواب کو سچ ثابت کرنے پر کیوں تل گئی ہو لڑکی؟" یمی آپی کے تیز لہجے میں کہنے پہ وہ جیسے حقیقت کی دنیا میں واپس آئی۔ اس کے آنسو ایک دم سے رکے' اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"مسئلہ یہ نہیں کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں' مسئلہ یہ ہے کہ تم کیا "کرنا" چاہتی ہو۔ تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے عیان کہ ان اونچے شملوں والوں کے پاس غلاموں کی کمی نہیں ہوتی اور نہیں ہی ان کی بندوقوں

میں گولیوں کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارا تو کچھ نہ جائے گا عیان حسن شاہ مگر وہ غریب ناحق مارا جائے گا۔" سیمی آپی سانس لینے کو رکیں جبکہ عیان کا سانس حلق میں اٹک گیا۔

"وہ میرے لیے ایڈونچر نہیں ہے سیمی آپی۔ محبت کرتی ہوں اس سے۔" وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔

"چپ ہو جاؤ عیان خدارا چپ ہو جاؤ۔ اس بات کو یہیں دفن کر دو۔" سیمی آپی اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں مگر عیان سر گھٹنوں میں دیے مراقبے کی کیفیت میں تھی۔ صبح اس کا آخری پیپر تھا اور اسے فیصلہ کرنا تھا... آخری فیصلہ۔

"بی بی..." وہ ایک دم سوتے سے اٹھ بیٹھا۔ وہ پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا۔ سانسیں بہت تیز چل رہی تھیں۔

"شکر ہے یہ خواب تھا" داؤد نے شکر ادا کیا' وہ اپنے گھر میں تھا۔ وہ ننگے پاؤں چلتا ہوا سیڑھیاں اتر کر صحن میں دائیں طرف رکھے گھڑے کی جانب بڑھا۔ زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پانی پی رہا تھا جب اسے وہ خواب دوبارہ سے یاد آیا' بڑی مشکل سے اس نے گھونٹ کو حلق سے نیچے اتارا۔

کوئی تعویذ ہو ردِ بلا کا
میرے پیچھے محبت پڑ گئی ہے

وہ وہیں کونے میں سر تھام کے بیٹھ گیا۔ اس نے خواب میں خود کو بہت چیختے سنا تھا۔ بہت اندھیرا اور ویرانی تھی۔ عیان کی گردن سے خون نکل رہا تھا۔ داؤد نے کبھی خود کو اتنا بے بس محسوس نہ کیا تھا لیکن جو "خواب" وہ لے کر اس حویلی میں آیا تھا اس کے سامنے اس "خواب" کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ تو گویا یہ طے پا چکا تھا کہ اسے اپنا مقصد ہر حال میں حاصل کرنا ہے چاہے دل خالی رہ جائے۔ وہ بے جان قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"تم ٹھیک تو ہو نا داؤد؟" پارکنگ ایریا میں کھڑی وہ گاڑی لاک کرتے داؤد سے بے تابانہ انداز میں چوتھی بار پوچھ چکی تھی۔ داؤد نے کچھ حیران ہو کر پلٹ کے اس کی طرف دیکھا جو آنسو پینے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔ داؤد کو وہ صدیوں کی بیمار دکھائی دی۔

"میں ٹھیک ہوں بی بی۔" اس نے وہی تلخی بھرا رویہ اپنایا۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئی کیونکہ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے اپنے دادا کا مان رکھنا ہے اور داؤد کو زندہ دیکھنا ہے۔ یہ اس کا اور داؤد کا آخری دن تھا ایک ساتھ میں کیونکہ اس کے بعد وہ دادا سے بات کرے گی کہ وہ داؤد کو ہٹا دیں اس نوکری سے۔

عیان کا پیپر ہو چکا تھا اور وہ باقی دوستوں کے درمیان کھڑی سب کو سن رہی تھی مگر دیکھ صرف کچھ دور کھڑے داؤد کو رہی تھی۔ عزتیں' روایات' ذات پات۔ کہنے کو یہ لغت کے عام الفاظ ہی سہی مگر ان کو جھیلنا بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ عیان بھی اسی درد سے گزر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوج چکے تھے' وہ بار بار آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلتی' ہلو کے سہارے کھڑی تھی اتنے میں عشنا یوسف ان کے قریب آئی اور سب سے ہیلو ہائے کرنے کے بعد عیان سے مخاطب ہوئی۔

"اے ہیلو! کہاں ہو؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ خیر چھوڑو... مجھے تمہیں بہت اہم بات بتانی ہے۔ کچھ وقت کے لیے میرے ساتھ چل سکتی ہو؟" وہ اپنا ڈائمنڈ رنگ والا بایاں ہاتھ ضرورت سے زیادہ ہی جھلا رہی تھی کیونکہ حال ہی میں اس کی منگنی ہوئی تھی۔

"سوری عشنا آئی ایم ناٹ فیلنگ گڈ... میں واپس جاؤں گی پھر کبھی سہی۔" عیان یہ کہہ کر آگے بڑھنے لگی جب عشنا نے اسے بازو سے تھام لیا۔

"اگر بات بہت ضروری نہ ہوتی تو میں کبھی اصرار نہ کرتی بٹ بلیو می یہ تمہارے لیے بہت ضروری ہے سن لو۔" وہ خلاف توقع ذرا نرمی سے بولی۔

"اوکے چلو۔" عیان نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایکچوئلی عیان تم اپنے ہنری کیول (Henry Cavell) سے کہو کہ ذرا دور ہی رہے۔" عیان نے سر ہلایا اور داؤد کو کہہ کر کیفے ٹیریا میں چلی آئی۔

"عشنا پلیز ذرا جلدی..." عیان نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا عیان حسن شاہ کہ میں نے داؤد کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ تو بات کچھ یوں ہوئی کہ میں نے ذہن پہ بہت زور ڈالا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے کیونکہ میں خوب صورت چہروں کو کبھی نہیں بھولتی۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"ایکچوئلی میں نے اسے پہلی بار نیویارک برج (Bridge) پہ دیکھا تھا جب میں اے لیول میں تھی اور اپنے انکل کے پاس نیویارک گئی تھی کرسمس کی چھٹیاں منانے۔" اس نے اپنے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا اور نظریں ترچھی کر کے عیان کو دیکھا جو بہت حیرانی و بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے پتا تھا تم بالکل یقین نہیں کرو گی اس لیے میں نے سوچا کہ پہلے کچھ شواہد اکٹھے کروں پھر تم سے بات کروں اس لیے یہ دیکھو" عشنا نے تیزی سے اپنے ٹیب پہ انگلی چلاتے ہوئے ایک جگہ پہ رک کے موبائل اس کے سامنے کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے داؤد ملک کا پورٹ فولیو۔ جو کہ میرے کزن اور فیانسی رضوان خان نے بنایا ہے۔ ایکچوئلی یہی لینے میں مجھے دیر ہو گئی کیونکہ رضوان انکل سے ناراضی کی بنیاد پر جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔" عشنا نے اپنی انگوٹھی کو انگلی میں گھماتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو پھٹی پھٹی نظروں سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ یقیناً" وہ داؤد ہی تھا۔ ایک کے بعد ایک تصویر اس کے داؤد ہی ہونے کی تصدیق کر رہی تھی۔ رہی سہی کسر نیچے لکھے نام نے پوری کر دی تھی جہاں جلی حروف میں داؤد ملک ولد حیدر ملک اسٹوڈنٹ آف آکسفورڈ اسکول آف بزنس لکھا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ ہولے سے بڑبڑائی۔

"رضوان پروفیشنل فوٹو گرافر ہے نیویارک میں اور خوب صورتی کو بہت ایڈمائر کرتا ہے تو جب ہم نے اسے نیویارک برج پر دیکھا تو رضوان نے اسے اپنا پورٹ فولیو بنوانے کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔ داؤد لندن سے اپنے رشتے داروں کے ساتھ چھٹیاں منانے آیا تھا۔" وہ رکی۔

"اب بتاؤ کیا کہتی ہو؟" عشنا نے اس سے استفسار کیا۔

"نہیں 'یہ داؤد نہیں ہو سکتا۔ وہ تو کراچی کے کسی گوٹھ کا رہنے والا ہے اور ہمارے بہت پرانے ملازم کا رشتہ دار ہے 'یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔" عیان نے بے چینی سے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

"اوکے... تو تمہیں یقین نہیں ہے کہ یہ وہی داؤد ہے... آل رائٹ ہم ابھی چیک کر سکتی ہو وہ اس طرح کہ میں نے جس داؤد کو نیویارک میں دیکھا تھا اسے ایکروفوبیا (اونچائی کا خوف) تھا۔ وہ نیویارک برج سے نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا اور اس کے دوست اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اسے نیچے دیکھنے سے چکر آنے لگتے تھے۔ اور ویسے بھی..."

"اوکے عشنا۔ تھینک یو فار یور Antcipation بٹ آئی ہیو ٹو گو ناؤ" عیان عشنا کی بات درمیان سے کاٹ کر اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوکے۔" عشنا نے بھی سر ہلاتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دی تھی اور اپنا ٹیب دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پہ اطمینان تھا۔

وہ کیفے ٹیریا سے باہر نکلی تو داؤد حسب معمول اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا مگر وہ پارکنگ ایریا جانے کی بجائے یونیورسٹی کے سیکنڈ فلور کی طرف بڑھی وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب اسے داؤد کی آواز سنائی دی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں بی بی۔" اس کے معصومیت سے "بی بی" کہنے پہ عیان کا دل چاہا کہ وہ پھٹ پڑے اور جا کر اس سے پوچھے کہ وہ کون ہے۔ کس مقصد کے لیے آیا ہے ان کی زندگی میں۔ مگر وہ خاموشی سے دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ مجبوراً" وہ بھی پیچھے ہو لیا۔ وہ بالکونی میں آ کر کھڑی ہو گئی اور پلٹ کے داؤد کو دیکھا

جس کی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے عیان کو گھورا تو وہ گھبرا کر تیزی سے وضاحتی انداز میں بولی۔
"وہ میں تمہیں دکھانے لائی تھی کہ وہ شخص دو دن سے ہمیں فالو کر رہا ہے" اس نے ایسے ہی اندازے سے نیچے درخت کے پاس کھڑے شخص کی طرف اشارہ کیا جو فوراً" درخت کی اوٹ میں ہو ا تھا مگر داؤد تیزی سے نیچے جھکا مگر پھر اپنا سر تھام کے پیچھے ہٹا' وہ کراہا تھا اور عیان سب ہی کچھ بھول بھال کر اس طرف بڑھی۔
"داؤد' تمہیں کیا ہو رہا ہے۔" وہ گھبرا گئی اور روہانسی ہو کر اس سے پوچھنے لگی۔ وہ وہیں نیچے بیٹھ گیا اسے شدید چکر آ رہے تھے۔
"داؤد ہم نیچے چل رہے ہیں پلیز اٹھو..... میں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گی سیکنڈ فلور پہ۔ داؤد تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ پلیز دیر نہ کرو میرا دل بند ہو رہا ہے۔" اس کے قریب بیٹھے وہ رو ہی پڑی تھی پھر ہمت کر کے اٹھی اور داؤد کو لے کر نیچے اترنے لگی۔
"داؤد یہ پانی پیو۔" عیان نے اسے بنچ پہ بٹھا کر پانی کی بوتل دیتے ہوئے کہا۔ وہ پانی پینے لگا۔ وہ زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ابھی بھی رو رہی تھی۔ داؤد نے سرخ آنکھوں سے تعجب کے ساتھ دیکھا جو اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔
"آئی ایم سوری داؤد' یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اب کبھی ایسا نہیں کروں گی۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ نہ جانے کون کون سے غم تھے جن پہ ابھی رونا تھا۔ داؤد بڑی خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی مگر خود سے کیے وعدوں نے اس کی سانسوں کو جکڑ رکھا تھا جب وہ رو رو کے تھک گئی اور داؤد خود کو روک روک کے' تو دونوں واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شام کے پانچ بج رہے تھے مگر بادلوں کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم "واپسی" کا سفر کر رہے تھے جو یقیناً" تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ٹریفک جام تھا۔ لوگ پاگل ہو رہے تھے مگر یہ دونوں اپنے آپ میں گم تھے اچانک عیان نے سوال کیا۔
"تمہیں ایکروفوبیا کب سے ہے داؤد؟" داؤد کے سامنے کی ونڈ اسکرین دھندلانے لگی اور اس دھند میں ماضی کے بہت سے منظر ہلکورے کھانے لگے مگر ایک منظر سب سے اہم تھا اور یقیناً" اذیت ناک بھی۔ وہ لندن کی ایک کہر زدہ قیامت خیز سردی کی صبح تھی۔ دھند کی وجہ سے حد نگاہ صفر تھی۔ High Street میں Merceere Eastgate Oxford کے لگژری فلیٹس جس کی 23 ویں منزل کی ایک بالکونی' جس میں ایک خوب صورت مرد اپنے پانچ سالہ بیٹے کو الٹا لٹکائے کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ بچے کی چیخیں دل دہلا دینے والی تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے اور آسمان کی طرف جا رہا ہے۔ جب اس کی چیخیں تھمنے لگتیں تو اس کا باپ اپنے بیٹے کی کمر پہ تھپکی دیتا۔
"میرا شیر' شیر بنے گا میرا بیٹا" اس کی ماں پاگلوں کی طرح چیختی چلی جاتی یا پھر اپنے شوہر کے دائیں بائیں چکر کاٹنے لگتی۔
"پلیز خدا کے لیے رحم کریں' یہ معصوم بچہ ہے اگر آپ کا ہاتھ سرک گیا..... حیدر پلیز ایسا کیوں کرتے ہیں' دیکھیں اس کی آنکھیں سرخ پڑ گئیں ہیں۔" ماں کی گریہ وزاری۔
"بند کرو یہ ڈرامہ اس طرح یہ مرد بنے گا۔ ملکوں کی سات پشتوں نے ایسا جوان نہ دیکھا ہو گا۔" اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کی بنیاد پر وہ سمجھانے کے انداز میں کہتا یہ جانے بغیر کہ اس کی یہ بھلائی ان کے بیٹے کے لیے ساری عمر کا روگ بن سکتی ہے۔ ٹریفک کھل چکی تھی اور گاڑیوں کے مخصوص شور نے اسے حال میں لا پٹخا تھا۔

"تو بالآخر وہ وقت آن پہنچا جب ان دونوں کے لوح آئندہ پہ جدائی کندہ کر دی گئی۔ عیان نے داؤد کی سمت دیکھا اسے ہمیشہ کی طرح اس کا بایاں کندھا اور ہاتھ نظر

آرہا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گاڑی اپنے مخصوص رستوں پہ رواں دواں تھی جب اچانک داؤد نے بریک لگائی' عیان کا دل انجانے خوف سے کانپ اٹھا۔ ان کی گاڑی کے سامنے ایک گاڑی کھڑی تھی' جس کی ان کے گزرنے کا رستہ بند ہو چکا تھا۔ داؤد نے ہارن بجایا تو ایک شخص اس کی کھڑکی پر جھکا اور ذرا بے ڈھنگے انداز میں کہنے لگا۔

"بات کرنی ہے ملک صاحب۔" اس نے ایک طرف بنے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا اور بغور عیان کو دیکھا۔ داؤد نے زور سے دروازہ کھولا جو اس شخص کو لگا تھا' وہ بے ساختہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ داؤد باہر نکلا اور پچھلا دروازہ کھول کر عیان کو کہا۔

"چلیں بی بی' یہاں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

عیان چپ چاپ نیچے اتر گئی۔ درختوں کے جھنڈ میں اندھیرا تھا مگر تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی وجہ سے کم محسوس ہو رہا تھا۔ عیان' داؤد کے بالکل ساتھ چل رہی تھی کیونکہ وہ اتنے سارے آدمیوں کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔

داؤد دائرے میں کھڑے آدمیوں کے درمیان جا کھڑا ہوا جہاں سامنے ایک آدمی گاڑی کے بونٹ پہ ایک ٹانگ رکھے غرور سے کھڑا تھا۔ عیان نے دیکھا' داؤد کے چہرے پر بالکل خوف نہ تھا۔

"کہاں گم رہتے ہیں ملک صاحب۔ دیکھیں چاہنے والوں نے ڈھونڈ ہی نکالا۔ اب جو ڈیل ہوئی اس کے مطابق لڑکی دو اور بادشاہت لو۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا اور اپنے ایک بندے کو اشارہ کیا جو عیان کی طرف بڑھا۔ عیان نے داؤد کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔

"یہ ڈیل کینسل سمجھو' یہ اب نہیں ہوگا۔" وہ عیان کو لے کر واپس مڑنے لگا۔

"کیسے نہیں ہوگا ملک صاحب' یہ طے ہو چکا ہے اور اس کام میں زبان سب سے اہم چیز ہے۔"

"میں نے کہا ناں کہ لڑکی نہیں ملے گی اگر نہیں دوں گا تو کیا کرو گے" وہ تن کے کھڑا ہو گیا۔

"دیکھ ملک ہم لڑنے نہیں آئے۔ ہمارے درمیان یہ ڈیل ہوئی تھی کہ تم لڑکی ہمارے حوالے کرو گے اور ہم سارے علاقے کی راجدھانی تمہارے حوالے۔ ہماری ملکوں سے بات طے ہو چکی ہے۔ ہم نے آج کی تاریخ میں لڑکی ان کے حوالے کرنی ہے۔"

اب کہ اس نے مصالحتی انداز اپنایا مگر داؤد ڈر کا نہیں۔ وہ حق دق کھڑی عیان کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنے لگا جبکہ وہ آدمی تیزی سے درمیان میں آیا۔

"جس نے بھی ہاتھ لگایا بی بی کو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔ تم سب جانتے ہو ناں مجھے" داؤد نے دھاڑ کے کہا تو وہ آدمی رک گیا پھر پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا۔

"دیکھ ملک' جذباتی نہ ہو میرے بھائی۔ یہ بہت بڑی ڈیل ہے یار۔" وہ رکا پھر بولا۔

"لیکن اگر تو نہ مانا تو انگلی تو ٹیڑھی کرنی پڑے گی۔"

"کیا کرو گے تم ہاں۔ کیا کرو گے۔" داؤد نے اسے پیچھے دھکیلا۔ اسی وقت اس آدمی کا فون بجا۔ وہ داؤد کو شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے کال ریسیو کرنے لگا۔ اگلے ہی لمحے اس کا انداز بدلا تھا اور وہ فوراً" اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ داؤد کچھ حیران ہوا ان کے یوں اچانک چلے جانے پر۔ اب وہ عیان کی طرف پلٹا جو خوف زدہ سے اس کے بازو سے چپکی کھڑی تھی۔

"بی بی چلیں۔" وہ آگے بڑھنے لگا۔

"تم کون ہو داؤد؟ ہماری زندگیوں میں کیوں آئے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" اس کی آواز بھرا گئی جبکہ وہ طیش سے پلٹا۔

"کبھی کسی اپنے کو مرتے دیکھا ہے۔ عیان حسن شاہ۔ میں نے دیکھا ہے۔ جانتی ہیں کتنی تکلیف ہوتی ہے' کیسا درد ہوتا ہے جب آپ کو وجود بخشنے والا خود لاوجود ہو جائے۔ نہیں دیکھا ناں پر میں نے دیکھا بھی ہے اور سہا بھی ہے اور جانتی ہیں مجھے اس مقام تک لانے والا کون ہے؟ وہ شخص جو مجھے دو وقت کی روٹی دے کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے مجھے خرید لیا۔" وہ رکا۔

"میں برباد کر دوں گا سب کچھ۔۔۔ میں برباد کر دیتا

سب کچھ۔۔۔ مگر آج میں۔۔۔ میں ہار گیا۔" یہ دکھ اور غصے کی ملی جلی کیفیت تھی جو اس پر طاری تھی۔ اس نے حیران سی کھڑی عیان کو کندھے سے تھام کے قریب کیا۔

"میں بتانا چاہتا ہوں بی بی کہ میں کیوں ہارا۔۔۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ میں سب بتادینا چاہتا ہوں۔۔۔ بی بی میں۔۔۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس سیدھی اس کی آنکھوں میں پڑی تھیں۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے تیزی سے عیان کو چھوڑا تھا کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ آنے والا کون ہے۔ جان تو عیان بھی گئی تھی مگر وہ داؤد کی طرف دیکھ کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

"مجھے تم پہ یقین ہے داؤد اور تم جو بھی ہو جیسے بھی ہو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اس سے۔" قدرت اللہ شاہ کے قدم سست پڑے تھے جبکہ تبریز شاہ کی چال میں اور تیزی آئی۔ اس نے ہاتھ میں رائفل تھام رکھی تھی وہ عیان پہ جھپٹا' اسے بازو سے تھام کے قدرت اللہ شاہ کے حوالے کیا اور خود داؤد پہ بندوق تان لی۔ بادل زور سے گرجے۔ مگر قدرت اللہ شاہ اس سے بھی زیادہ زور سے دھاڑے۔

"دکھادی ناں اپنی اوقات تم نے بھی داؤد ملک۔ تم کیا سمجھے تھے کہ میں اپنی پوتی تمہارے حوالے کرکے خود آنکھیں بند کرکے بیٹھ جاؤں گا۔ تم جیسے چھوٹے لوگ ان اوچھے ہتھکنڈوں سے ہی اپنی قسمت سنوارتے ہیں ہمیشہ اور بڑے لوگوں کی۔۔۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں داجان کیا ہوا ہے؟ آپ کیوں کہہ رہے ہیں یہ سب داؤد سے" وہ چیخ کے بولی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

"تم چپ رہو عیان۔ تم جو کر چکی ہو وہی کافی ہے۔" جلال شاہ نے عیان کو کھینچ کے تھپڑ دے مارا۔

"بی بی کا قصور نہیں ہے۔ میں ہی انہیں یہاں لایا ہوں۔" داؤد بولا۔

"دیکھا نانا ابا۔" تبریز نے قہربار نظروں سے داؤد کو دیکھا۔

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں داجان بس ختم کریں یہ ڈرامہ۔" جلال شاہ کا بس نہ چل رہا تھا وہ کیا کر ڈالیں۔

"تبریز! یہ زندہ نہ بچ سکے۔" عیان چیخی۔ داؤد نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ داؤد نے جھٹکا کھایا گو کہ محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے دل پہ دونوں پاؤں رکھ کے کھڑا ہو گیا ہے۔ بہت جان لیوا تکلیف۔ مگر اگلے لمحے اس کو جلال شاہ کی دبی دبی چیخ سنائی دی۔ داؤد نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی سامنے کھڑی عیان لہرا کے گری' اس کی گردن سے خون کی ندی بہہ نکلی تھی۔ قدرت اللہ شاہ تو پتھرا گئے تھے۔ داؤد اس کی طرف بڑھا مگر تبریز نے اپنی رائفل اس پہ خالی کردی اور تب ہی بارش کا پہلا قطرہ دھرتی سے آن ملا تھا۔ داؤد نے اسے بھاگ جانے کا اشارہ کرتی عیان کی انگلیوں کو ساکت ہوتے دیکھا تھا۔ مگر پھر وہ خود ہی ساکت ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

اندھیرا' دھواں' گولی' خون اور پھر اندھیرا' داؤد نے آنکھیں کھولیں۔ اسے اپنی آنکھوں کے پیچھے اور اپنے سینے میں شدید درد محسوس ہوا۔ اس کا ذہن آہستہ آہستہ ماحول سے ہم آہنگ ہو رہا تھا۔

"ماما۔۔۔ ماما بھائی' پلیز۔ ماما' دیکھیں بھائی کو ہوش آ گیا۔" بے تحاشا روتی لڑکی کی آواز اسے سنائی دی۔ کچھ دیر بعد ایک عورت اس پہ جھکی اسے کہہ رہی تھی۔

"داؤد۔۔۔ میرے بچے میری جان۔" وہ اس کی ماں تھی۔ یقیناً" وہ اس کی ماں ہی تھی جو اسے بے تحاشا چومتے ہوئے خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ اس کا ذہن ایک بار پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

"بی بی۔۔۔ بی بی۔" وہ ہولے سے بڑبڑایا پھر اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ تیز روشنی کی وجہ سے اسے آنکھیں پوری کھولنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اسے ایک بار پھر اسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"ماما۔۔۔ بھائی کو ہوش آگیا۔ ماما دیکھیں ناں پلیز۔"

لڑکی نے لفظوں کے رد و بدل کے ساتھ وہی بات دہرائی۔ داؤد نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا کیونکہ اسے اپنے جسم میں شدید درد محسوس ہوا۔

"داؤد بیٹا! ہاؤ آر یو فیلنگ ناؤ" اس کی ماں نے بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے اس کے بال سنوارے جبکہ ان کے پیچھے کندھے کے پاس کھڑی لڑکی جو بے تحاشا خوب صورت تھی' وہ اس کی بہن تھی دعا ملک۔ داؤد نے نظریں گھما کے دیکھا' وہ اسلام آباد میں اپنے گھر میں اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بہن بے تحاشا رو رہی تھی جبکہ اس کی ماں اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کو اس کے ہاتھ چومنے لگی۔

"میں یہاں کیسے... آیا ماما؟" وہ بہت وقت سے یہ الفاظ بول پایا۔ جبکہ اس کی ماں نے نظریں چراتے ہوئے فقط اتنا کہا۔

"بخشی چھوڑ کے گیا تھا" خاموشی کا وقفہ ان کے درمیان ٹھہرا اور سرک گیا۔

"یہ تم نے کیا کیا ہے داؤد۔ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ کیوں ہوا ہے یہ سب۔ بخشی جب تمہیں وہاں سے لایا تو تم شاید اپنی زندگی کی آخری سانسیں بھی لے چکے تھے۔" ایک اور طویل خاموشی کا وقفہ۔ اس کی ماں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

"اس سارے معاملے کو کانفیڈینشل رکھنے کے لیے مجھے ایسے ایسے لوگوں کے پاس جانا پڑا جن سے میں بات کرنا پسند نہ کرتی تھی۔" وہ تلخ ہوئیں۔ داؤد نے خالی نظروں سے اپنی ماں کا خوب صورت چہرہ دیکھا جسے وقت چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ ایک بہت بڑی بیورو کریٹ اور باکمال عورت۔ "آخر کو قدرت اللہ شاہ کی پوتی پہ فائرنگ ہوئی تھی۔" داؤد جیسے گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔ اسے وہ رات یاد آئی اپنی مکمل تباہی سمیت۔

"بی بی!" وہ ہلکے سے بڑبڑایا اور پھر چیخا۔ وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھا تھا اور جسم میں ہونے والے شدید درد کے باوجود باہر کو بڑھا۔ اس دوران اس کی ماں اور بہن مسلسل چیخ رہی تھیں اور اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ رک ہی نہیں رہا تھا۔ قصور اس کا نہیں تھا دراصل اسے کچھ سنائی ہی نہ دے رہا تھا اور نہ کچھ دکھائی۔ محبت یہی تو کرتی ہے۔ وہ آپ کے ذہن کو ایک ایسی آرٹ گیلری تک محدود کر دیتی ہے جس میں ہر طرف محبوب کی تصویریں ہی آویزاں ہوتی ہے۔ داؤد کو چلنا دشوار تھا مگر وہ بھاگ جانا چاہتا تھا وہیں' جہاں وہ تھی جسے اس نے سب سے زیادہ اپنی نفرت کا نشانہ بنایا تھا۔

"رک جاؤ داؤد... وہ مر چکی ہے... عیان مر چکی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی ماں کی سانسیں یوں پھول گئی تھیں جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں۔ وہ رک گیا یوں جیسے کبھی نہ ہل پائے گا۔ کبھی آگے نہ بڑھ پائے گا۔ پھر وہ کھڑکی کی طرف بڑھا تھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے وہ جیسے اپنے زندہ ہونے کا یقین کرنا چاہ رہا تھا۔

"آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔" وہ اتنی زور سے چیخا کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم پر لگے سارے ٹانکے ادھڑ گئے ہوں۔ وہ وہیں زمین پہ بیٹھ گیا اس کی روتی ہوئی ماں اور بہن اس کی طرف بڑھیں۔

وہ خاموش ہو گیا تھا کہ جیسے شہر خموشاں کا باسی ہو۔

کچھ حادثے زندگی میں ایسے بھی ہوتے ہیں
کہ انسان بچ تو جاتا ہے مگر زندہ نہیں رہتا

"مجھے یوکے جانا ہے اسی ہفتے۔" کھانا کھاتے ہوئے اس کی ماں کے ہاتھ رکے جبکہ دعا کے چہرے پہ بے چینی رقص کرنے لگی پھر نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولنے لگیں۔

"ٹھیک ہے تم جانے کی تیاری کرو میں۔ ذیشان صاحب سے بات کرتی ہوں۔" وہ اٹھ کے جا چکی تھیں جبکہ وہ وہیں بیٹھا تھا بالکل ساکت۔ دعا نے اسے جھجکتے ہوئے بغور دیکھا۔ وہ گلاس ٹیبل کی سطح کرید رہا تھا۔ اس کی لک بالکل چینج ہو چکی تھی۔ گول گلے والی وائٹ اینڈ بلیو ٹی شرٹ جینز' بالوں کا کریو (Crew)

کٹ اور ہلکی ہلکی شیولائٹ گولڈن کلر کی ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت مکمل انگلش لک میں تھا جیسے وہ شروع میں تھا۔ وہ ناقابل یقین حد تک خوب صورت تھا اور یقیناً دعا بھی غیر معمولی حسن رکھتی تھی لیکن ان دونوں بہن بھائیوں قسمت عام لوگوں کی طرح نہیں تھی اور نہ ہی ان کی زندگی۔ دعا نے حسرت و یاس بھری نگاہوں سے اپنے بھائی کو دیکھا جو تب تک یہاں بیٹھا رہنے والا تھا جب تک کوئی اسے اپنے کمرے میں جانے کو نہ کہتا۔

"تم... تم آج کل کیا کر رہی ہو؟" داؤد نے اسے دیکھتے ہوئے خالی لہجے میں پوچھا جس پر وہ معصوم و حساس لڑکی نہال ہی ہو گئی۔

"میں ایم ایس سی کر رہی ہوں سائیکالوجی میں... بھائی" وہ رک رک کر بولی۔ ان دونوں کا تعلق ایسا ہی تھا۔ بچپن میں جب بھی وہ پاکستان آتا تو وہ اسے یونہی دیکھا کرتی تھی چھپ کے۔ کبھی ماما کے پیچھے سے تو کبھی کتاب کے پیچھے سے۔

"ہوں" وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی کہنا چاہتی تھی کہ اسے اور ماما کو داؤد کی ضرورت ہے مگر اس نے اپنے بھائی کو مرتے دیکھا تھا اندر سے۔ وہ اس کی آنکھوں کی ویرانیاں نہیں دیکھ سکتی تھی اس لیے خاموش ہو رہی۔ بے شک بعض معاملات میں خاموشی تریاق کا کام کرتی ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ گریٹ ایسٹر اسٹریٹ پہ چلتا چلا جا رہا تھا' جب وہ شمال کی جانب لیونارڈ اسٹریٹ (Leonard) کی جانب مڑا اور روئی کے گالوں کی طرح برف اس کے چہرے سے ٹکرائی تو اس کی تمام حسیات جاگ اٹھیں۔ چلتے چلتے اس کا بدن شل ہو چکا تھا۔ دو ماہ ہو گئے تھے اسے لندن آئے ہوئے اور ان دو ماہ میں اس نے ایک ہی تو کام کیا تھا۔ وہ دن بھر چلتا رہتا تھا' جب شل ہو جاتا تو بیٹھ جاتا اور جب بیٹھ بیٹھ کر بدن شل ہو جاتا تو پھر سے چل دیتا جانے لوگوں میں کس کو تلاش کرتا تھا جو تھک کے نہ دیتا۔ وہ لیونارڈ اسٹریٹ (Leonard street) میں موجود' دا بک کلب (TBC) (The book Club) کی پرشکوہ عمارت میں داخل ہوا جہاں عموماً" لوگ اپنے کام کے سلسلے میں ہونے والی میٹنگز (Meetings) میں شرکت کے لیے آتے۔ اسٹوڈنٹس کے لیے الگ جگہ مختص تھی جہاں وہ کمبائن اسٹڈی کے علاوہ chill کرنے کے لیے بھی آتے تھے۔ وہ گلاس وال کے بالکل سامنے والی ٹیبل پہ جا بیٹھا۔ اس کی آرڈر کی کافی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ کافی کی سطح پر جمنے والی تہ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ شاید ہر وہ چیز جسے نظرانداز کیا جاتا ہے اس کے اوپر ایسی ہی کوئی تہ جم جاتی ہے۔ جو اندر ہونے والے تغیر و تبدل کو ڈھانپ دیتی ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ تہ کے نیچے کی دنیا پر سکوت ہے۔ اندر کی ٹوٹ پھوٹ نظر نہیں آتی' اس پہ بھی تو لوگ تہیں چڑھا لیتے ہیں۔ اس کی سوچ کہاں سے کہاں جا نکلی تھی جب اچانک کوئی اس کے سر پہ کھڑا ہو کر تقریباً" چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ڈیوڈ... اٹس یو... ان بلیو ایبل" داؤد نے خالی خالی نظروں سے سامنے موجود دو لڑکوں کو دیکھا دماغ نے ان کے چہروں کو کوڈ کیا اور ان کے نام لبوں نے ادا کیے۔

"روحیل۔ جیک۔" وہ آہستگی سے بڑبڑایا۔ اب کے وہ دونوں اس پہ جھپٹ پڑے تھے۔ پرانے دوستوں سے ملنے کی خوشی بچپن میں سب سے زیادہ عیدی ملنے کی خوشی سے بھی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ داؤد نے مسکرانا چاہا مگر ناکام رہا۔ روحیل اور جیک اتنے خوش تھے کہ وہ اس کی خوشی دیکھنا بھی بھولے ہوئے تھے۔ وہ دونوں داؤد کے بڈی تھے' اسکول' ہائی سکول' یونیورسٹی' وہ اپنی تکون کی وجہ سے ہر جگہ مشہور تھے۔ اب وہ دونوں ایک اوسط درجے کی کنسٹرکشن کمپنی چلاتے تھے۔ دس بجے کے قریب وہ کلب سے نکل آئے تھے لیکن کار کی بجائے لوکل ٹرانسپورٹ سے داؤد کے گھر جانے کا فیصلہ روحیل نے آناً" فاناً" کیا۔ وہ تینوں لیونارڈ اسٹریٹ کے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے جا رہے تھے' جب

روحیل نے کہا۔

"کیا ہوا بول کیوں نہیں رہے۔ تم جب سے ہمیں ملے ہو صرف سن رہے ہو۔ پہلے تم نے ہمیں آنے کی اطلاع نہیں دی پھر ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش تک نہ کی۔ اب جب سے ملے ہو میوٹ (Mute) ہو کے پھر رہے ہو" وہ تیز تیز انگلش میں شکوے کرتا داؤد کو اپنا سا لگا تھا۔ داؤد نے اپنی جیکٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر آپس میں مسلے اور اپنے چہرے پر ہاتھ لگاتا ہوا بولا تو فقط اتنا۔

"کچھ بھی نہیں ہوا... تم اپنی سناؤ۔" اور وہ واقعی لگا اپنی سنانے۔

"تمہیں وہ جورڈن یاد ہے، جس کی گرل فرینڈ تم پہ لٹو ہو گئی تو اس نے تمہارے خلاف یونیورسٹی میں احتجاج کروایا کہ تم باقاعدہ پلاننگ سے سب کی گرل فرینڈز کو پھانستے ہو اور جان بوجھ کے بریک اپس کرواتے ہو... نہیں آیا یاد ڈیوڈ' وہی جورڈن جو فرانس سے آیا تھا اور..."

"اس کا ذکر کہاں سے نکل آیا... ہونہہ جورڈن' دا فرنچ ڈنکی" (Franch Doncky) جیک تو جورڈن کے خلاف بھرا بیٹھا تھا۔

"کیسے ناں نام لوں وہ ہمارا بزنس پارٹنر ہے 25 پرسینٹ کا جناب انتھونی جیکسن دا انگلش منکی (English Monkey)۔" روحیل نے جیک سے حساب بے باق کیا تو وہ دونوں قہقہہ لگا کے ہنسے جبکہ داؤد بھی اس دفعہ مسکرانے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ میں ایسا حزن تھا کہ ان دونوں کی ہنسی تھم گئی۔

"کوئی مسئلہ ہے ڈیوڈ؟" جیک نے پوچھا۔ اس کے دوست اسے ڈیوڈ ہی کہتے تھے اس لیے تمام انگریز دوست اسے ڈیوڈ ہی کہتے تھے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے جب دائیں طرف سے آتا ایک کپل ان سے ٹکرا گیا۔

"اوہ... سوری گائیز (guys)۔ لڑکی کے بال، بہت خوب صورت تھے کمر تک آتے براؤن بال بالکل سیدھے۔ داؤد جیسے مجسمہ ہی بن گیا تھا۔ وہ کچھ فاصلہ ہی طے کر پائے تھے کہ داؤد دیوانہ وار بھاگتا ہوا اس لڑکی کی طرف گیا تھا وہ اپنے حواسوں میں ہرگز نہ تھا۔

"وہ بی بی... بی بی" کہتا ہوا اس لڑکی کے بال اور اوور کوٹ ہٹاتے ہوئے اس کی گردن دیکھنے لگا۔ لڑکی خوف زدہ ہو کر چیخنے لگی تھی۔ روحیل اور جیک نے بڑی دقتوں سے اس لڑکی اور ساتھ موجود لڑکے کو تسلی کروائی تھی کہ یہ سب ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے جبکہ داؤد اس لڑکی کا چہرہ دیکھنے کے بعد فٹ پاتھ پہ بیٹھ گیا۔ اس کی کنپٹیوں میں شدید درد جاگا تھا جس نے سارے سر کا محاصرہ کر لیا تھا' درد اتنا شدید تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی بھی سنسنا اٹھی تھی۔ روحیل اور جیک دونوں پریشانی سے اس کی جانب بڑھے۔ روحیل نے داؤد کی حالت کے پیش نظر جیک کو کہا۔

"جیک' ڈاکٹر رچرڈ سے پوچھو' کیا وہ اس وقت مل سکتے ہیں۔" روحیل نے جیک کے ایک ڈاکٹر انکل کا نام لیا۔ جیک نے کال ملائی اور روحیل تب تک کیب روک چکا تھا۔

★★★

"ان کاغذات پہ سائن کرو" روحیل نے کچھ پیپرز اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت روحیل' جیک اور جورڈن کے درمیان ان کے آفس میں موجود تھا۔

"یہ کیسے کاغذات ہیں؟" داؤد نے ٹس سے مس نہ ہوتے ہوئے روحیل سے پوچھا۔

"خود ہی دیکھ لو۔" روحیل بھی اپنی ریوالونگ چیئر پر مزید پھیل کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ جب سے آیا تھا سب ہی اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ داؤد نے کاغذات کو سرسری انداز میں دیکھا پھر کاغذات روحیل کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"میں اتنی انویسٹمنٹ نہیں کر سکتا۔" کاغذات کے مطابق وہ تینوں داؤد کو کمپنی میں 25 فیصد حصے کا شراکت دار بنا رہے تھے۔ روحیل اور جورڈن ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

"انویسٹمنٹ کی ساری اماؤنٹ اب تک ہمارے

اکاؤنٹ میں جمع بھی ہو چکی ہو گی' آپ کو صرف یہاں سائن کرنے ہیں۔" داؤد کچھ نہ بولا وہ صرف ان دونوں کو گھور رہا تھا۔ جیک فوراً" بولا۔

"ہمیں ایسا کرنے کو آنٹی نے کہا تھا۔ ویسے بھی تمہیں جاب تو کرنی ہی ہے تو کیوں ناں سارے دوست مل کے اس کمپنی کو دیوالیہ کریں۔" وہ تینوں قہقہہ لگا کے ہنسے اور داؤد نے پیپرز پہ سائن کر دیے۔

☆ ☆ ☆

ایک... دو' تین... آٹھ۔ پورے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ داؤد کے باہر کی دنیا بہت بدل گئی تھی مگر اندر سے وہ وہیں اسی نقطے پر کھڑا تھا۔ سائیکالوجسٹ کی تھراپیز' سائیکاٹرسٹ کی میڈیسنز سب ناکام ہو چکا تھا۔ اس کے اندر پلنے والا ایک جذبہ سب پہ حاوی تھا۔ دا پلینرز کمپنی (The planer's company) کے نام سے وہ کمپنی جو ان چار لوگوں نے مل کے بنائی تھی وہ اس وقت انگلینڈ کی ٹاپ فائیو کنسٹرکشن کمپنیز میں شامل تھی۔ وہ خود millioner سے Billioner ہو چکا تھا مگر یہ سب اس کے کسی کام کا نہ تھا کیونکہ وہ تو آج بھی خود کو ویسا ہی کنگال سمجھتا تھا جیسا اس رات ہوا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے داؤد' اس دفعہ سیلیبریشن پارٹی کہاں ہونی چاہیے۔" روحیل نے داؤد کے قریب پڑے ریموٹ کو اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ اس وقت کمپنی کی عالیشان عمارت میں موجود اسپیشل سٹنگ روم میں موجود تھے۔ جیک نے کھڑکی کی سلائیڈز اٹھائیں اور پھر داؤد کی موجودگی کی وجہ سے فوراً" گرا دیں۔ انہوں نے حال ہی میں نیویارک میں ایک بہت بڑے پراجیکٹ کا کانٹریکٹ حاصل کیا تھا۔

پارٹی کے بعد وہ بہت تھک گیا تھا ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے وہ صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھا اور اپنے جوتے اتارنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنی گھڑی اتاری اور اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔ گلاس میں پانی ڈال کے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اسے اپنی میڈیسن لینی تھی۔ وہ اپنے دھیان میں کمرے میں داخل ہوا تھا لیکن اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے پلٹ کے دیکھا' ایک انتہائی خوب صورت لڑکی کارنر میں موجود کاؤچ پہ بیٹھی تھی مگر اس کا لباس... وہ پیشہ ورانہ انداز میں مسکرائی۔ داؤد کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

"آؤٹ... آئی سے آؤٹ آف ہیئر۔" وہ دھاڑا تو وہ لڑکی جلدی سے باہر نکل گئی۔ داؤد نے روحیل کا نمبر ملایا' وہ جیسے کال کے انتظار میں ہی بیٹھا تھا۔

"کیسا لگا سرپرائز۔" وہ چہکا۔

"شٹ اپ... بہت ذلیل حرکت کی ہے تم نے۔ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔" وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے فون بند کر کے اسے پاور آف کر دیا۔ اپنی میڈیسن کھانے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلا۔ وہ لڑکی ڈرائنگ روم کے صوفے پہ بیٹھی تھی اب اس نے لانگ کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اس کی طرف بڑھی اور لجاجت بھرے انداز میں کہنے لگی۔

"پلیز مجھے یہاں رات بھر رہنے دیں... میں ایک رات ہی سہی مگر سکون سے رہنا چاہتی ہوں۔" داؤد کو اس کی آنکھوں میں سچائی نظر آئی۔

"تم اس کمرے میں سو سکتی ہو۔" وہ کہہ کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا جبکہ وہ لڑکی اسے ممنون نظروں سے دیکھتی ہوئی دوسرے کمرے کی جانب چل دی۔

"پھر کتنی قیمت دی تم نے اس لڑکی کی... رات کو تو کچھ اور کہہ رہے تھے... دیکھو داؤد ایسی لڑکیوں کے لیے پیسہ ضائع نہیں کرتے... کیوں خریدا اسے۔" روحیل کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ داؤد نے ایلن روز' نامی اس کال گرل کو خرید لیا ہے جسے روحیل نے اس کے پاس بھیجا تھا' وہ ان ہی احساسات کا شکار ہو رہا تھا جبکہ داؤد اس سے مکمل بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مزید بولا۔

"ٹھیک ہے غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اسے

بھیجا۔۔۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ کسی عورت کا غم کوئی عورت ہی بھلا سکتی ہے۔" روحیل کی بات داؤد کو تیر کی طرح لگی تھی۔ وہ زور سے ٹیبل پر ہاتھ مار کے کھڑا ہوا۔

"تم اس لڑکی کا موازنہ بی بی سے کر رہے ہو۔" وہ غرایا۔

"تو تم اس حقیقت کو کیوں نہیں مان لیتے کہ وہ لڑکی مر چکی ہے۔۔۔ تم ہمیشہ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم سے اور بھی بہت سے لوگ وابستہ ہیں۔۔۔ تمہیں یہ ماننا ہوگا کہ وہ مر چکی ہے اور۔۔۔"

"شٹ اپ۔۔۔ جسٹ شٹ اپ۔ تم نے کہا بھی کیسے کہ وہ۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑی جیسے اس میں کہنے کی سکت نہ ہو۔ "جو بات میں ان آٹھ سالوں میں ایک بار بھی خود سے نہ کہہ سکا وہ تم نے چند لمحوں میں کیسے کہہ دی روحیل۔" داؤد کی سانسیں پھولنے لگیں۔ یہ اس کے انگزائٹی اٹیک کی پہلی علامت تھی۔ روحیل پریشانی سے اس کی طرف بڑھا' داؤد نے اسے پیچھے کیا۔

"اگر میری سانسیں چل رہی ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اسے کچھ نہیں ہوا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا یقین اس بات پہ اور بھی پختہ ہو رہا ہے۔" داؤد نے انگلی اٹھا کے روحیل کو وارن کرتے ہوئے کہا۔

"آج کے بعد ایسا کبھی مت کہنا روحیل۔ بی بی کو کچھ نہیں ہوا۔" اس کے لہجے میں تھکن اتر آئی تھی۔ اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے منرل واٹر کی بوتل منہ کو لگا گیا۔ روحیل نے اسے میڈیسن تھمائی تو وہ اس کا ہاتھ جھٹکتا باہر نکل گیا۔

روحیل اور جیک اس کے اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ داؤد اس لڑکی کو Hampstead villege میں موجود اپنے گھر لے کر جانے والا تھا۔ وہ دونوں اس سے بات کرنے آئے تھے جہاں ایک نیا انکشاف ان کا منتظر تھا۔

اس لڑکی کا نام ایلن روز نہیں بلکہ خائفہ محمود ہے۔ فلسطین سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے فلسطین سے اسمگل کر کے یہاں لایا گیا۔ کامن ویلتھ گیمز (Common wealth games) کے موقع پر دنیا سے 42 ہزار لڑکیاں اسمگل کر کے لائی گئی تھی جن کی یہاں یہ منڈی لگی تھی۔ خائفہ کو بھی وہیں سے خریدا گیا۔ وہ ایک مسلمان لڑکی ہے۔ اور اس جیسی بیالیس ہزار لڑکیاں بچی گئیں اور خریدی گئیں تب کہاں جا سوئیں یہ ہیومن رائٹس این جی اوز کہاں گئیں حقوق نسواں کا پرچار کرتی تنظیمیں۔۔۔ کہاں تھے خود کو تہذیب یافتہ کہلانے والے ورلڈ پاور کے حامل ممالک۔۔۔ کیا یہی ہے اب تک کی انسانی تہذیب کہ جہاں عورتوں کی منڈیاں لگتیں ہیں ہونہہ۔۔۔ وہ نفرت سے ہنکارا بھرتے ہوئے ذرا دیر کو رکا۔

"دنیا میں اگر کوئی مسلمان اپنی بیٹی' بہن یا بیوی کو حجاب پہنواتا ہے یا اسے تعلیم حاصل کرنے سے روکتا ہے تو اسے fundamentalist کہا جاتا ہے۔ مسلمان ممالک پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ انہیں دہشت گرد کہا جاتا ہے لیکن کسی یورپین ملک میں عورتوں کی اتنی بڑی منڈی لگتی ہے تو کسی تنظیم کے منہ سے بھاپ تک نہیں نکلتی۔" وہ رکا پھر بولا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا' صرف ایک لڑکی کو بچایا ہے۔۔۔ صرف ایک کو۔" داؤد یہ کہہ کر خاموش ہو گیا تھا جبکہ ان دونوں کے لیے بہت سے سوالات چھوڑ گیا تھا۔

داؤد خائفہ کو اپنے گھر لے آیا تھا جہاں وہ ہر ویک اینڈ پہ آتا تھا۔ اس کا گھر Mension میں Hampstead تھا جو دنیا کی سب سے مہنگی پراپرٹی سمجھی جاتی ہے Hampstead villege چیرنگ کراس سے چار کلومیٹر کے شمال مغربی فاصلے پر موجود تھا۔ یہ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ یہاں John Keats کا گھر بھی موجود ہے جہاں اس نے اپنی شہرہ آفاق نظم Ode to a nightingate لکھی تھی۔ خائفہ کو یہاں رہنا تھا اور دوسرے ملازموں کو سپروائز کرنا تھا۔ وہ بہت خوش تھی اور داؤد بہت پریشان تھا۔ سب دوائیاں اپنا اثر کھو چکی تھیں۔

وہ رات ڈیڑھ بجے کے قریب گھر سے نکل آیا' وہ بھاگنے کے انداز میں تیز تیز چل رہا تھا مگر اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ جانے کیوں وہ Hampstead اسلامک سینٹر کے سامنے رک گیا۔ کافی دیر باہر کھڑا رہنے کے بعد اس نے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ مسجد میں صرف چند ہی لوگ موجود تھے۔ وہ ایک کونے میں جا بیٹھا ایک طرف بیٹھے قاری صاحب بہت لحن سے سورہ رحمٰن کی تلاوت کر رہے تھے' داؤد کو یک گونہ سکون ہوا۔ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی اسے وہاں بیٹھے ہوئے جب ایک بزرگ اس کے برابر آن بیٹھے اور اس سے پوچھنے لگے۔

"پریشان دکھائی دیتے ہو بیٹا۔ کیا بات ہے؟" جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ اس شخص کو سب بتا دے جو اس نے جھیلا ہے.... جو اس پہ بیتا ہے اس نے وہ سب بتا دیا تھا جو شاید وہ ابھی تک کسی کو نہ بتا پایا تھا۔

"کیوں ہوا میرے ساتھ ایسا.... میرے ساتھ ہی کیوں۔ میں نے تو کبھی بی بی کو آنکھ بھر کے دیکھا نہ تھا۔ ابھی تو میں نے کوئی خواب نہ دیکھا تھا پھر کیوں.... کوئی ہے میرے اندر جو روتا رہتا ہے۔ میں کھوکھلا ہو گیا ہوں ان آٹھ سالوں میں.... میں جی بھر کے رونا چاہتا ہوں اپنے ہر خسارے پر لیکن میری آنکھیں جیسے بنجر ہو گئی ہیں' مجھے سکون نہیں ملتا ایسا کیوں ہوا.... کیوں ہوا۔"

"کیوں کہ تمہاری نیت ٹھیک نہیں تھی۔ تم وہاں اپنا انتقام لینے گئے تھے اور تم نے لیا بھی۔ پھر تمہیں انعام کس چیز کا ملتا۔ انعام تو صبر کرنے والوں کو' معاف کر دینے والوں کو ملتا ہے۔" داؤد نے چونک کر ان بزرگ کی طرف دیکھا' وہ ہولے سے مسکرائے۔

"انتقام لینا میرا حق تھا" اس نے اپنا کمزور سا دفاع کیا۔

"اور معاف کر دینا تم پہ واجب.... کیوں کہ تمہاری ماں انہیں معاف کر چکی تھی۔ خود کو انتقام کی بھٹی میں جھونک کے انسان خود پہ ہی ظلم کرتا ہے اور بے شک اللہ ظالموں کو پسندیدہ نہیں رکھتا۔ جب انسان کے اندر سے دھواں نکلنے کا رستہ ہی نہیں تو جانے کیوں وہ اپنے اندر آگ لگاتا ہے.... نادان انسان" داؤد کو چپ لگ گئی تھی۔ تصویر کا یہ رخ اسے کبھی کسی نے نہ دکھایا تھا۔ "میری مانو اگر سکون چاہیے تو واپس جاؤ اپنی ماں کے پاس۔ دنیا میں اگر کہیں سکون ہے تو ماں کی پناہوں میں ہی ہے.... اور اگر ہو سکے تو اس لڑکی کی قبر پہ جا کے فاتحہ پڑھ لو۔ سکون مل جائے گا۔"

"نہیں وہ زندہ ہے.... پلیز ایسا نہ کہیں" داؤد نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا تو انہوں نے داؤد کا ہاتھ مضبوطی سے دبایا۔

"اب اٹھو اور دو رکعت نفل پڑھ لو اور دعا مانگو.... فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔"

"سر نماز کیا کرتی ہے.... سبھی کہتے ہیں نماز پڑھو۔" وہ رکے اور مسکرائے۔ پھر بولے۔

"نماز کچھ نہیں کرتی صرف اتنا کرتی ہے کہ تمہیں تمہارے رب سے ملا دیتی ہے۔" داؤد خاموشی سے اٹھ کے ان کے ساتھ وضو کرنے چل دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے وہ لاہور ایئرپورٹ پہ اترا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ یہ سوچ کر گیا تھا کہ وہ زندگی کی کوئی سانس اس ملک کی فضا میں نہ لے گا لیکن وقت نے اسے وہیں لا پھینکا تھا جہاں سے وہ چلا تھا۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع دعا کو دی تھی جو لاہور آنے کے بعد اسے ریسیو کرنے والی تھی۔ دعا کی شادی اپنے کلاس فیلو شہوز سے ہوئی تھی اور وہ شادی کی بعد لاہور شفٹ ہو گئی تھی۔ اس نے دور ہی سے ہاتھ ہلاتی دعا کو پہچان لیا' وہ آج بھی اتنی ہی جذباتی تھی۔ داؤد سے ملنے کے بعد وہ کتنی دیر اس کے گلے لگی روتی رہی۔ شہوز شرمندہ سا ہو گیا پھر دعا کو پیچھے ہٹانے کو آگے بڑھا مگر داؤد نے اسے روک دیا۔ اس کی بہن پہلی بار اس کے گلے سے لگی تھی۔

"چلیں بھائی" وہ خود ہی داؤد سے الگ ہوتے ہوئے کہنے لگی۔ دعا نے اسے بتایا کہ وہ ماما کو داؤد کے

آنے کا بتا چکی ہے اور وہ کل کسی بھی وقت آئیں گی۔
ان کی کچھ ضروری میٹنگ تھی آج۔ دعا کچھ زیادہ ہی بولنے لگی تھی یا پھر اس کی خاطر اتنا بول رہی تھی جبکہ شہوز اس سے اچھا خاصا متاثر نظر آرہا تھا۔ ڈنر کے دوران دعا نے باتوں ہی باتوں میں اپنی سالگرہ بھی یاد دلا دی جو کل تھی' داؤد اس حسن اتفاق پہ حیران تھا۔ ڈنر کے بعد داؤد کمرے میں جانے کی بجائے لان میں چلا آیا جبکہ شہوز اور دعا شہوز کی معذوریاں کو کھانا کھلانے اور میڈیسن دینے چلے گئے۔ دعا کا گھر بہت خوب صورت اور بڑا تھا۔ وہ خاموشی سے ایک کونے میں پڑے بنچ پہ جا بیٹھا اور چاند کو دیکھنے لگا۔ اسے اپنے تاثرات چھپانے میں وقت ہو رہی تھی لیکن اسے مضبوط رہنا تھا۔ وہ یہاں ان حقیقتوں کا سامنا کرنے کرنے آیا تھا جن سے وہ آٹھ سالوں سے چھپتا پھر رہا تھا۔ اس نے شہوز کو تیزی سے پورچ کی جانب جاتے دیکھا پھر وہ مڑا اور اس کی جانب آیا۔

"آئی ایم سو سوری داؤد بھائی' مجھے ذرا اسپتال تک جانا ہوگا۔ ایک ایمرجنسی کیس آگیا ہے۔ پھر صبح ملاقات ہوتی ہے۔" داؤد نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ شہوز جانے کے لیے مڑ گیا۔ اسے دعا کا بھائی پہلی نظر میں ہی کچھ مغرور سا لگا تھا۔

"کیوں نہ ہو بھئی۔" شہوز بڑبڑایا۔ کچھ دیر بعد دعا دونوں ہاتھوں میں کافی کے مگ اٹھائے داؤد کے پاس چلی آئی۔ داؤد کا مگ اسے تھماتے ہوئے وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔ کتنا ہی وقت خاموشی کی نذر ہوگیا۔ پھر داؤد بولا۔

"تمہیں ماما کو نہیں بتانا چاہیے تھا میں خود ان کے پاس جاتا۔"

"ارے نہیں بھائی' وہ میری برتھ ڈے کی وجہ سے خود آنے والی تھیں کچھ دنوں میں۔۔۔ پھر آپ کی وجہ سے انہوں نے سوچا کہ وہ ابھی آجاتی ہیں۔" دعا نے جلدی سے وضاحت کی مبادا اس کا موڈی بھائی برا ہی نہ مان جائے۔

"تمہیں برتھ ڈے گفٹ کیسا چاہیے دعا؟" داؤد کے یوں پوچھنے پر وہ کچھ جھینپ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگی۔

"اگر آپ پہلے کہتے تو میں آپ سے یہی کہتی کہ آپ واپس آجائیں۔ مجھے میرے بھائی کی ضرورت ہے مگر اب میں آپ سے یہ کہوں گی کہ مجھے اپنا پرانا والا بھائی واپس چاہیے جو یہ سمجھتا تھا کہ وہ دنیا کو اپنے ابرو کے اشارے سے چلا سکتا ہے۔ جسے بابا سے عشق تھا اور جو شرارتیں کر کر کے گوروں کے ناک میں دم کیے رکھتا۔" داؤد گھبرا کے کھڑا ہوگیا اور تیز تیز سانس لینے لگا۔

"مجھے عشاء کی نماز پڑھنی ہے دعا۔" وہ واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

وہ دعا مانگ کے فارغ ہوا تو دعا دروازہ ناک کر کے اس کے کمرے میں چلی آئی۔ داؤد نے جائے نماز تہ کر کے رکھی اور واپس مڑا۔ دعا اس کے سائیڈ ٹیبل پہ پڑی دوائیوں کو اٹھا اٹھا کے دیکھ رہی تھی اس کے چہرے پر شاک کے نشان واضح تھے۔ وہ ایک سائیکاٹرسٹ تھی اور شہوز کے ساتھ مل کے ایک بہت بڑا پرائیوٹ اسپتال چلا رہی تھی داؤد صوفے پہ بیٹھ گیا۔ وہ دعا کے نارمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

"میں یہ کہنے آئی تھی داؤد بھائی کیا آپ صبح میرے اسپتال کا وزٹ کر سکتے ہیں۔" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی' داؤد گلا کھنکار کے اس سے مخاطب ہوا۔

"دراصل دعا مجھے کل سارا دن عفان کے ساتھ رہنا ہے' کچھ ضروری میٹنگز ہیں۔" دعا داؤد کے منیجر عفان کو جانتی تھی۔

"کچھ دیر کے لیے' پلیز بھائی منع نہ کریں۔" دعا نے لجاجت سے کہا۔

"او کے میں ضرور کوشش کروں گا۔" داؤد نے ذہن میں کیلکولیشن کرتے ہوئے کہا۔

"تھینکس۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ حیرت انگیز طور پہ اس نے داؤد سے ان دوائیوں کے بارے میں کچھ نہ پوچھا تھا۔ داؤد کچھ مطمئن ہوا۔

داؤد نے گھڑی دیکھی جہاں ڈیڑھ بج گیا تھا مگر اسے

ایک پل کی بھی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ داؤد نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی باقی ساری میٹنگز کینسل کروا دیں اور خود عفان اور ڈرائیور کے ہمراہ دعا کے اسپتال کو چل دیا۔ دعا کو اس کے آنے کی پیشگی اطلاع مل چکی تھی اس لیے وہ اپنے سینئر اسٹاف کے ہمراہ اس کے استقبال کو کھڑی تھی۔ یہ ایک نہایت شاندار اور وسیع نفسیاتی اسپتال تھا۔ دعا نے سب کے ساتھ اس کا تعارف کروایا۔ وہاں کچھ صحافی بھی موجود تھے۔ داؤد تو اب اس پروٹوکول کا عادی ہو چلا تھا۔ دعا کے ہمراہ وہ اس کے آفس چلا آیا۔ کچھ دیر میں شہوز بھی چلا آیا۔ داؤد سے رات کے بعد اب ملاقات ہو رہی تھی شہوز کی۔ دعا نے چائے کے ساتھ ریفریشمنٹ منگوالیا۔ کہیں دور کسی مریض کی چیخیں بلند ہوئیں۔ داؤد نے چونک کر دعا کو دیکھا جبکہ شہوز نے سر اپنے ہاتھوں میں گرالیا۔

"کمرہ نمبر 5 کا مریض بہت تنگ کر رہا ہے یار۔" شہوز نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔

"لیکن اسے تو میں نے اینستھیسیز یا دیا تھا؟" دعا نے آواز دبا کے کہا اور داؤد کو دیکھا جو ذرا بے چینی سے آوازیں سن رہا تھا۔

"او کے میں دیکھتی ہوں۔" وہ اٹھی تو داؤد بھی بے ساختہ کھڑا ہوا۔

"کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں؟" داؤد نے جیسے التجا کی۔

دعا نے حیران نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا جو اس کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ دعا بھی تیزی سے کمرہ نمبر 5 کی طرف بڑھی۔ کسی کے چیخنے اور کراہنے کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ داؤد کے اندر اتھل پتھل شروع ہوئی تھی کیونکہ وہ یہ آواز کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ دعا جلدی سے اس کے آگے سے گزر کر کمرے میں چلی گئی جبکہ وہ اپنی ساری توانائی جمع کر کے کمرے میں داخل ہوا تھا جہاں ایک لڑکی داؤد کی طرف پشت کیے چیخ رہی تھی اور اس کے لمبے بال فرش پہ پھسل رہے تھے۔ داؤد اس کی پشت سے پہچان گیا تھا، وہ تیزی سے گھوم کر اس کے سامنے آیا۔

"بی بی۔" وہ ہلکے سے بڑبڑاتا ہوا اس کے قریب زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا جبکہ وہ ایسی چپ ہوئی کہ جیسے کسی نے فل والیوم پہ چلتا ٹی وی ایک کلک سے میوٹ کر دیا ہو۔

"بی بی میں داؤد.... میں داؤد ہوں۔ پلیز ایسے نہ دیکھیں" وہ رو رہا تھا بے تحاشا۔

"دعا یہ بول کیوں نہیں رہیں" داؤد نے ساکت کھڑی دعا سے استفسار کیا۔

"یہ بول نہیں سکتیں ان کے گلے میں گولی لگی تھی جس کی وجہ سے ووکل کارڈز (Vocal Cards) شدید Demage ہوئے ہیں" داؤد کو لگا وہ بھی کبھی نہیں بول سکے گا۔

"اور باقی کی کہانی ہم بتا دیتے ہیں ملک صاحب۔" تبریز کی سرد آواز اور قدرت اللہ شاہ کی سرد نگاہیں، وہ سن ہو گیا تھا۔ عیان گویا کسی خواب سے چونکی تھی اور اس کے لیے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کونسا خواب زیادہ بھیانک ہے۔ جو وہ دیکھ چکی ہے وہ یا جو دیکھ رہی ہے۔ عیان نے داؤد کو پیچھے دھکیلا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ وہ کسی بھی طرح داؤد کو وہاں سے ہٹانا چاہتی تھی۔ ایک بے بس لڑکی اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

"تم سمجھے کہ ہم بھول گئے ہیں سب کچھ مگر یہ تمہاری بھول تھی ملک۔ اب تم نہیں بچ پاؤ گے۔ قسمت ہر دفعہ یاوری نہیں کرتی۔" تبریز کے کہنے پر عیان زرد ہوئی تھی جیسے کوئی بے جان لاشہ۔ اس نے داؤد کو پیچھے دھکیلا اور پیر قدرت اللہ شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ جبکہ تبریز شاہ خباثت سے بولا۔

"اور ہم نے کیسا دانہ پھینکا داؤد ملک تم خود چل کے یہاں آ گئے ہو۔" اس نے عیان کی طرف اشارہ کر کے کہا جبکہ عیان اتنا زور سے چیخی کہ اپنے حواس کھو بیٹھی۔ دونوں نرسیں اس کی طرف بڑھیں، داؤد نے اسے تھامنا چاہا۔

"ہاتھ مت لگانا ملک ورنہ یہ دن تاریخ کا بدترین دن

ہو گا۔" قدرت اللہ شاہ دھاڑے، داؤد رکا۔ تبریز چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔
"تمہارا اس پہ کوئی حق نہیں یہ حق صرف میرا ہے۔"
"میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ تمہارا۔ اگر تم قدرت اللہ شاہ کے نواسے ہو تو میں بھی ان کی بیٹی کی اولاد ہوں۔" داؤد نے تبریز کا سر دیوار میں دے مارا۔ الفاظ تھے یا صور اسرافیل سب ہی اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے تھے اسی لمحے بختاور شاہ بھی کمرے کے دروازے میں آن رکی تھیں۔ داؤد چیخ رہا تھا' رو رہا تھا۔
"ہاں میں بختاور کا بیٹا ہوں جن کا بیٹا ہونا میری سزا بن گیا۔ آپ کی محبت میری زندگی کی خوشیاں نگل گئی ماما۔ آپ کا باپ جو آپ کے ساتھ نہ کر سکا وہ اپنی پوتی کے ساتھ کر رہا ہے۔" وہ روتے ہوئے اسی کونے میں بیٹھ گیا۔ پیر قدرت اللہ شاہ نے دروازے کے سہارے نیچے بیٹھی اپنی عزیز از جان بیٹی کو دیکھا اور ان دونوں کے لیے وقت کی گردش رک گئی۔

☆ ☆ ☆

داؤد کو ہمیشہ لگتا کہ اس کی زندگی میں کچھ کمی ہے۔ ہاں اس کی زندگی میں ماں باپ کے پیار کی ایک فیملی کی کمی تھی۔ وہ پیدائش سے لے کر ساری عمر لندن میں رہا کیونکہ اس کے ماں باپ اسے پاکستان میں اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ حیدر ملک نے بھی بختاور سے شادی اپنے پسند سے کی تھی جس کی ان کے خاندان میں شدید مخالفت کی گئی۔ ان کے والد نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ حیدر کا نام باقی نہ رہنے دیں گے یہی وجہ بنی کہ جب داؤد پیدا ہوا تو انہوں نے اسے انگلینڈ کے شہر لیڈز میں موجود اپنے ایک دوست کی فیملی کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے چھپائے رکھنا چاہتے تھے جب تک کہ وہ کسی قابل نہ ہو جائے مگر داؤد یہ بات نہ جانتا تھا۔ اس کے ماں باپ چھٹیوں میں اس سے ملنے آتے اور یہ دن داؤد کی زندگی کے خوشگوار دن ہوتے مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا اس کے ذہن میں یہ بات جڑ پکڑ رہی تھی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ کیوں

نہیں رہ سکتا۔ وہ شروع سے ہی جارحانہ انداز کا حامل تھا۔ وہ پندرہ سال کا تھا جب چھٹیوں میں اس کی فیملی اس سے ملنے آئی' وہ بہت خوش تھا وہ ماما' بابا اور دعا کے ساتھ سینٹرل پارک گیا۔ اس کے ماں' باپ ایک جگہ بیٹھ گئے جبکہ وہ خوشی خوشی کانچ کی گڑیا جیسی اپنی بہن کو گھمانے لگا جو اس وقت دس سال کی تھی۔ وہ دونوں بینچ پہ بیٹھے باتیں کررہے تھے جب ایک خاتون اپنے نو دس سالہ بیٹے کو لیے ان کے برابر آن بیٹھی۔ وہ تیز تیز بولتی اپنے بیٹے کو کچھ کہہ رہی تھی۔ داؤد لاشعوری طور پہ ان کی طرف متوجہ ہوا' وہ عورت اس بچے کو کسی سے دوران ملاقات' خاموش رہنے کا کہہ رہی تھی اور یہ کہ وہ اسے ماں نہ کہے کیونکہ وہ نہیں چاہتی کہ اس کے ہسپانوی بوائے فرینڈ کو پتا چلے کہ وہ اس کی اِل لیگل اولاد ہے۔ برطانوی معاشرے کے لحاظ سے تو یہ ایک عام بات تھی مگر داؤد کے لاشعور میں کہیں یہ بات اٹک گئی تھی کہ اِل لیگل بچوں کو چھپایا جاتا ہے۔ وہ خاموش ہوا تھا۔ پہلی بار اس نے طویل خاموشی اختیار کی اور پندرہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ اپنے سود و زیاں کا حساب لگایا تو نتیجہ یہ نکلا کہ شاید وہ بھی اپنے والدین کی ایسی ہی غلطی ہے جسے وہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔

اسے خود سے گھن محسوس ہوئی پھر دعا سے حسد اور سب سے آخر میں اپنے والدین سے نفرت۔ اس دن کے بعد سے وہ صرف ایک برطانوی شہری تھا اور بس۔ اس کے کردار میں وہاں کی سب خوبیاں اور خامیاں تھیں۔ اٹھارہ سال کا ہونے کے بعد اس نے الگ گھر مانگا تھا جو اسے گفٹ کردیا گیا۔ وہ اتنا بدل گیا تھا کہ اس کے ماں' باپ انگشت بدنداں رہ گئے۔ انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ انجانے میں اپنے بیٹے کے ساتھ کیا کر بیٹھے ہیں۔ لیکن وہ اندر سے اپنے رشتوں کی محبت ختم نہ کر پایا وہ ماں کی بجائے باپ سے زیادہ قریب تھا اور کہا کرتا تھا کہ بابا میری پہلی محبت ہیں۔

جب وہ ایم بی اے کرچکا تو حیدر ملک نے اسے پاکستان بلانے اور سب سے متعارف کروانے کا فیصلہ کیا لیکن زندگی نے وفا نہ کی داؤد کو یہی بتایا گیا کہ ایک سنگین ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ پاکستان آیا اور اپنے باپ کی آخری رسومات ادا کیں۔ اس ایکسیڈنٹ کی حقیقت وہ کبھی نہ جان پاتا اگر وہ ماما کو ذیشان انکل سے بات کرتے نہ سن لیتا۔ ماما بے تحاشا روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"میں نے معاف کردیا انہیں ذیشان۔ میں نے معاف کردیا اپنے باپ کو' جس نے میرے بچوں کا باپ چھین لیا... ہم جانتے تھے ایسا ہوگا' جہاں کسی کا وار چلے گا وہ ہمیں برباد کرنے کی کوشش کرے گا... ہم اپنے بیٹے کو چھپاتے پھرتے تھے لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ یوں ہوجائے گا۔" ذیشان انکل انہیں تسلی دے رہے تھے جبکہ داؤد پہ بہت سے راز عیاں ہوئے تھے۔ اسے اپنے رویے پر شرمندگی ہوئی پھر اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ وہ اپنے ننھیال اور ددھیال کو لڑائے گا اس حد تک کہ سب ختم ہوجائیں اور اس کے لیے اس نے عیان حسن شاہ کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن تقدیر نے سب الٹ کر دکھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

جلال شاہ نے داؤد کا نکاح عیان سے کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ قدرت اللہ شاہ نے وقار شاہ کو حویلی سے نکال دیا تھا کیونکہ حیدر ملک کا قتل انہوں نے ہی بڑی منصوبہ بندی سے کروایا تھا جبکہ ان کی بیوی اور ان کے بچوں نے اپنے نانا کا ساتھ دیتے ہوئے ان سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ داؤد وقار شاہ کو معاف کردینے کا ارادہ رکھتا تھا کیونکہ زندگی سے وہ ایک بہت بڑا سبق لے چکا تھا کہ معاف کردینے میں ہی عظمت اور بھلائی ہے۔

"بھائی... آجائیں عیان اس کمرے میں ہے" داؤد کا نکاح ہوچکا تھا جب دعا اسے بلانے آئی تھی اور یہ داؤد کا ہی فیصلہ تھا وہ عیان سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے اٹھتا دیکھ کے روحیل اور جیک جو ابھی کچھ دیر پہلے پہنچے تھے' دونوں کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ داؤد نے اپنی مسکراہٹ بڑی مشکل سے روکی اور مدبر سی شکل بنا کے کمرے کی

طرف بڑھ گیا۔ داؤد دروازے کو ناک کر کے اندر داخل ہوا جہاں یمی آپی اور سارہ بھابھی اسے دیکھ کر ایک دم چپ ہوئیں اور پھر شرارتی انداز میں داؤد کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ عیان کاوچ پہ گلاس وال کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھی۔ اس نے کچے سیب جیسے سبز رنگ کی ٹخنوں کو چھوتی فراک پہن رکھی تھی جس پہ میرون امبر ایئڈری بنی ہوئی تھی۔ داؤد خاموشی سے اس کے برابر آن بیٹھا عیان کی پوزیشن میں کوئی فرق نہ آیا تھا وہ ہنوز گلاس وال سے باہر لان میں دیکھ رہی تھی۔ داؤد گھٹنوں پہ کہنیاں ٹکا کے آگے کو جھک کے بیٹھا تھا۔ وہ کبھی عیان کو زیادہ دیر تک سامنے سے نہ دیکھ پایا تھا۔ مگر ابھی اس نے دیکھا تھا' عیان بہت ضبط سے بیٹھی تھی مگر آہستہ آہستہ اس کے ضبط کی لگامیں ڈھیلی ہو رہی تھیں اور اس کی ہیزل براؤن آنکھیں پانیوں سے بھرتی جا رہی تھیں۔ داؤد نے گود میں دھرا اس کا حنا بستہ ہاتھ مضبوطی سے تھاما تھا' عیان کے آنسو بے قابو ہوئے۔ اس نے عیان کا دوپٹہ ذرا سر کایا اور بال پیچھے کیے۔ عیان کے رونے میں شدت آ گئی۔ اس نے وہ نشان دیکھا جو عیان کی گردن کے درمیان میں موجود تھا کافی بڑا نشان۔ داؤد نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے نشان کو ذرا سا رگڑا جیسے وہ مٹانا چاہ رہا ہو۔ عیان ہچکیوں سے رونے لگی' وہ شاید سارے غموں پہ آج ہی رو لینا چاہتی تھی۔ اس نے داؤد کا ہاتھ جھٹکا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے اونچی آواز میں رونے لگی۔ داؤد نے بے ساختہ اسے ساتھ لگایا اسے دکھ ہو رہا تھا۔ وہ اگر کچھ کہنا بھی چاہ رہی تھی تو کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے داؤد کو یوں مضبوطی سے پکڑا تھا جیسے اسے اس کے کھو جانے کا ڈر ہو۔

"نہ روئیں بی بی مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" داؤد نے دو انگلیوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ عیان نے سر اٹھا کے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو داؤد نے زبان دانتوں تلے دبائی۔

"سوری سوری جب تک عیان کہنے کی پریکٹس نہیں ہو جاتی بی بی سے کام چلانا پڑے گا۔" وہ شرارت سے بولا جبکہ عیان حیران رہ گئی تھی کہ وہ صرف اس کے دیکھنے سے اس کے دل کا حال کیسے جان گیا۔ داؤد نے اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلا کے اسے ساتھ لگایا تو وہ دونوں آسودگی سے مسکرا دیے۔ یقیناً" زندگی بہترین گزرنے والی تھی۔ کوئی ان کے قریب گنگنایا تھا۔

تیری آنکھوں کے دریا کا اترنا بھی ضروری تھا
محبت بھی ضروری تھی' بچھڑنا بھی ضروری تھا
ضروری تھا کہ ہم دونوں طواف آرزو کرتے
مگر پھر آرزوؤں کا بکھرنا بھی ضروری تھا